MAUR-112 (N)

Masnavi-o-Rubaii

MAUR-112 (N) مثنوی ورباعی

مثنوی ورباعی

بلاک:1 مثنوی

اکائی۱: مثنوی کا فن، ہیئت اور اجزائے ترکیبی۔ دیگر اصناف سخن سے امتیاز

اکائی۲: اردو مثنوی نگاری کا آغاز وارتقا (دکن وشمال کے خصوصی حوالے سے)

اکائی۳: ملا وجہی، حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ

اکائی۴: میر اثر: حیات، ادبی کارنامے اور خواب وخیال کا جائزہ

اکائی۵: میر حسن: حیات، ادبی کارنامے اور سحر البیان کا خصوصی مطالعہ

اکائی۶: پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کا اجمالی جائزہ

بلاک:2 رباعی

اکائی۷: رباعی کا فن، خصوصیات اور آغاز وارتقا/ رباعی کی تعریف اور اس کی فنی خصوصیات

اکائی۸: اردو میں رباعی گوئی کا آغاز وارتقا

اکائی۹: حالی: حیات اور رباعی گوئی

اکائی۱۰: یاس یگانہ چنگیزی: حیات اور رباعی گوئی

اکائی۱۱: میر انیس: حیات اور رباعی گوئی

اکائی۱۲: اکبر الہ آبادی: حیات اور رباعی گوئی

اکائی۱۳: امجد حیدر آبادی: حیات اور رباعی گوئی

اکائی۱۴: فراق گورکھپوری: حیات اور رباعی گوئی

اکائی۱۵: اہم رباعی گو شعرا کی رباعی گوئی کا اجمالی جائزہ

کورس کا تعارف

اردو شاعری کی اصناف میں مثنوی کو خاص مقام حاصل ہے۔ یہ اپنی ہیئت اور موضوعات کے اعتبار سے نہایت وسعت کی حامل ہے۔ اسے بیانیہ صنف کی معراج تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو میں مثنوی کی دو شناختیں ہیں اول یہ ایک مکمل صنف ہے جو اپنے خاص موضوعات اور اپنی مخصوص ہیئت کی بنیاد پر پہچانی جاتی ہے۔ دوم مثنوی کو بطور ہیئت کسی دوسری صنف میں طبع آزمائی کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثنوی میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے اکثر محققین اسی بات کے قائل ہیں۔

مثنوی اردو زبان کی ایک معروف صنف سخن ہے۔ دیگر اصناف کی طرح یہ صنف بھی اردو میں فارسی سے مستعار لی گئی ہے۔ مثنوی اہل فارس کی ایجاد ہے اور انھوں نے اس صنف کو بام عروج پر پہنچایا ہے۔ شاہنامہ اور مثنوی معنوی اس پر شاہد و عادل ہیں۔ عربی زبان اس صنف سے عاری ہے۔ صنف مثنوی میں کسی خاص موضوع کی قید نہیں ہے۔ اسی طرح اس میں اشعار کی تعداد کی بھی کوئی حد مقرر نہیں ہے اس لئے مثنوی چند ابیات سے لے کر دفاتر تک ہو سکتی ہیں۔ اس میں بس ایک شرط کہ تمام اشعار آپس میں مربوط ہوں۔

اردو زبان میں دکن اور شمال دونوں ہی خطوں میں بہترین مثنویات تحریر کی گئی ہیں جن میں موضوعات کی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ ان میں اخلاق و آداب، پند و نصائح، فلسفہ و تصوف، حسن و عشق، سیاست و سماج، جنگ و جدال جیسے متنوع موضوعات ملتے ہیں۔

رباعی اردو شاعری کی ایک مشہور صنف سخن ہے جو زمانۂ قدیم سے اردو زبان میں رائج ہے۔ اردو رباعی گوئی بھی دیگر اصناف سخن کی طرح فارسی ادب سے مستعار ہے اور اسی کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ رباعی کی ابتدا، اس کے موجد اور کس زبان سے اس کی شروعات ہوئی ان تینوں باتوں میں محققین کی آرا مختلف ہیں لیکن قرین قیاس بات یہ ہے کہ رباعی کی ابتدا ۲۵۱ھ میں یعقوب بن لیث صفار کے عہد میں ہوئی اور اکثر محققین نے اس کے ایجاد کا سہرا رودکی کے سر باندھا ہے۔ رودکی فارسی زبان کا شاعر تھا چنانچہ اس صنف کی شروعات بھی فارسی زبان سے ہی مانی جاتی ہے۔

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جو 'رُبُـــعٌ' سے مشتق ہے جس کے لفظی معنٰی ہیں کسی چیز کا چوتھا حصہ۔ لفظ رباعی عربی لفظ رُبَاعٌ کی طرف منسوب ہے جس کے معنی ہوئے اَیْ مَـا رُکِّـبَ مِنْ أَرْبَعَةٍ (یعنی جو شے چار جز سے مل کر بنی ہو) اور اس میں 'ی' نسبتی ہے جو لفظ رباع کی طرف اس کی نسبت کو ظاہر کرتی ہے۔ گویا رباعی کا معنی ہوا چار والا۔ شعری اصطلاح میں رباعی وہ صنف سخن ہے جس میں چار مصرعے ہوں یا جو دو اشعار پر مشتمل ہو۔ اس

کو دوبیتی بھی کہتے ہیں اور قدما نے اسے ترانہ کے نام سے بھی موسوم کیا ہے نیز اسے جفتی اور چار مصراعی کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ دوبیتی اور ترانہ رباعی کے موجودہ اور مروجہ اوزان میں نہیں لکھے جاتے تھے۔

اصطلاح میں رباعی اس منظوم کلام کو کہتے ہیں جو صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہو جس کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے اور اس کے اوزان متعین ہیں۔

اس کورس میں ہم مثنوی اور رباعی کی تعریف، فنی خصوصیات اور اہم رباعی گو شعرا و مثنوی نگار سے متعارف ہوں گے۔

اکائی 1 ''مثنوی کا فن، ہیئت اور اجزائے ترکیبی۔ دیگر اصناف سخن سے امتیاز'' پر مبنی ہے۔اس میں مثنوی کے معنی نیز اس کی تعریف اور اجزائے ترکیبی پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔اس کے علاوہ دیگر اصناف سخن سے اس کے امتیاز پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 2 ''اردو مثنوی نگاری کا آغاز وارتقا (دکن وشمال کے خصوصی حوالے سے)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں مثنوی کے عہد بہ عہد ارتقا پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 3 ''ملا وجہی، حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں مثنوی ''قطب مشتری'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔نیز ملا وجہی کے ادبی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 4 میں ''میر اثر: حیات، ادبی کارنامے اور خواب وخیال کا جائزہ'' پر گفتگو کی گئی ہے۔اس میں میر اثر کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے مثنوی ''خواب وخیال'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 5 ''میر حسن: حیات، ادبی کارنامے اور سحر البیان کا خصوصی مطالعہ'' پر مبنی ہے۔اس میں میر حسن کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے مثنوی ''سحر البیان'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 6 میں ''پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کا اجمالی جائزہ'' پر گفتگو کی گئی ہے۔اس میں میر انیس کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے مثنوی ''گلزار نسیم'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 7 میں ''رباعی کا فن، خصوصیات اور آغاز وارتقا/رباعی کی تعریف اور اس کی فنی خصوصیات'' پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 8 ''اردو میں رباعی گوئی کا آغاز وارتقا'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں رباعی کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 9 ''حالی: حیات اور رباعی گوئی'' پر مبنی ہے۔۔اس میں حالی کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی رباعی گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 10 ''یاس یگانہ چنگیزی: حیات اور رباعی گوئی'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں یاس کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی رباعی گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 11 ''میر انیس: حیات اور رباعی گوئی'' کے عنوان سے قائم ہے۔اس میں میر انیس کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی رباعی گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 12 ''اکبر الہ آبادی: حیات اور رباعی گوئی'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں اکبر الہ آبادی کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی رباعی گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 13 ''امجد حیدر آبادی: حیات اور رباعی گوئی'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں امجد کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی رباعی گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 14 ''فراق گورکھپوری: حیات اور رباعی گوئی'' پر مبنی ہے۔اس میں فراق کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی رباعی گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 15 'اہم رباعی گو شعرا کی رباعی گوئی کا اجمالی جائزہ' پر گفتگو کی گئی ہے۔جس میں اردو کے اہم رباعی گو شعرا کی شخصیت اور احوال کا ذکر کرتے ہوئے اجمالی طور پر ان کی رباعی گوئی کی خصوصیات پیش کی گئی ہیں۔

بلاک:1 مثنوی

اکائی۱: مثنوی کا فن، ہیئت اور اجزائے ترکیبی۔ دیگر اصناف سخن سے امتیاز

اکائی۲: اردو مثنوی نگاری کا آغاز وارتقا (دکن وشمال کے خصوصی حوالے سے)

اکائی۳: ملا وجہی، حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ

اکائی۴: میر اثر: حیات، ادبی کارنامے اور خواب وخیال کا جائزہ

اکائی۵: میر حسن: حیات، ادبی کارنامے اور سحر البیان کا خصوصی مطالعہ

اکائی۶: پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کا اجمالی جائزہ

اکائی 1. مثنوی کا فن، ہیئت اور اجزائے ترکیبی، دیگر اصناف سخن سے امتیاز

ساخت

1.1 اغراض و مقاصد

2.2 تمہید

1.3 مثنوی کا فن، ہیئت اور اجزائے ترکیبی، دیگر اصناف سے امتیاز

1.3.1 مثنوی کا فن

1.3.2 ہیئت اور اجزائے ترکیبی

1.3.3 دیگر اصناف سے امتیاز

1.3.4 حاصل مطالعہ

1.4 آپ نے کیا سیکھا

1.5 اپنا امتحان خود کیجئے

1.6 سوالات کے جوابات

1.7 کلیدی الفاظ

1.8 کتب برائے مطالعہ

1.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

مثنوی کے فن سے واقف ہوں گے یعنی مثنوی کے لغوی و اصطلاحی معانی اور اس کی تعریف سے آگاہ ہوں گے۔

مثنوی کے اجزائے ترکیبی سے واقف ہوں گے۔

مثنوی اور دیگر اصناف سخن کے مابین امتیازات سے آشنا ہوں گے۔

1.2 تمہید

مثنوی اردو زبان کی ایک معروف صنف سخن ہے۔ دیگر اصناف کی طرح یہ صنف بھی اردو میں فارسی سے مستعار لی گئی ہے۔ مثنوی اہل فارس کی ایجاد ہے اور انھوں نے اس صنف کو بام عروج پر پہنچایا ہے۔ شاہنامہ اور

مثنوی معنوی اس پر شاہد و عادل ہیں۔عربی زبان اس صنف سے عاری ہے۔ صنف مثنوی میں کسی خاص موضوع کی قید نہیں ہے۔اسی طرح اس میں اشعار کی تعداد کی بھی کوئی حد مقرر نہیں ہے اس لئے مثنوی چند ابیات سے لے کر دفاتر تک ہوسکتی ہیں۔اس میں بس ایک شرط کہ تمام اشعار آپس میں مربوط ہوں۔

اردو زبان میں دکن اور شمال دونوں ہی خطوں میں بہترین مثنویات تحریر کی گئی ہیں جن میں موضوعات کی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ان میں اخلاق و آداب، پند و نصائح، فلسفہ و تصوف، حسن و عشق، سیاست و سماج، جنگ و جدال جیسے متنوع موضوعات ملتے ہیں۔

1.3 مثنوی کا فن، ہیئت اور اجزائے ترکیبی، دیگر اصناف سے امتیاز

1.3.1 مثنوی کا فن

اردو شاعری کی اصناف میں مثنوی کو خاص مقام حاصل ہے۔یہ اپنی ہیئت اور موضوعات کے اعتبار سے نہایت وسعت کی حامل ہے۔اسے بیانیہ صنف کی معراج تسلیم کیا جاتا ہے۔اردو میں مثنوی کی دو شناختیں ہیں اول یہ ایک مکمل صنف ہے جو اپنے خاص موضوعات اور اپنی مخصوص ہیئت کی بنیاد پر پہچانی جاتی ہے۔دوم مثنوی کو بطور ہیئت کسی دوسری صنف میں طبع آزمائی کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔مثنوی میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے اکثر محققین اسی بات کے قائل ہیں۔بعض حضرات نے مثنوی کو عشقیہ منظوم داستانوں تک محدود قرار دیا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔مثنوی کے صنفی اوصاف اور اس کے موضوعاتی تنوع پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''انواع شاعری میں یہ صنف تمام شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے، شاعری کی جس قدر انواع ہیں سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں، جذبات انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری، تخئیل ان تمام چیزوں کے لئے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا، مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے، اس بنا پر زندگی اور معاشرت کے جس قدر پہلو ہیں، سب اس میں آجاتے ہیں، عشق و محبت، رنج و مسرت، غیض و غضب، کینہ و انتقام، غرض جس قدر انسانی جذبات ہیں سب کے سماں دکھانے کا موقع مل سکتا ہے، تاریخ میں مختلف اور گوناگوں واقعات پیش آتے ہیں، اس لئے ہر قسم کی واقعہ نگاری کا کمال دکھایا جاسکتا ہے، مناظر قدرت، بہار و خزاں، گرمی و سردی، صبح و شام، یا جنگل بیابان، کوہ و صحرا، سبزہ زار وغیرہ کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے، اخلاق و فلسفہ، تصوف کے مسائل نہایت تفصیل سے ادا کئے جاسکتے ہیں۔''

(شعرالعجم (حصہ چہارم)، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء، ص ص ۱۸۹۔۱۹۰)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ مثنوی میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ حیات و کائنات کے تمام مسائل مثنوی میں بیان کئے جاسکتے ہیں۔

مثنوی کے لغوی و اصطلاحی معنی

مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے۔لفظ مثنوی 'ثَنَی' سے مشتق ہے جس کا مادہ 'ث، ن، ی' ہے۔اس کے لغوی معنی ہیں دو کرنا، دوہرا کرنا یا تہہ کرنا۔یعنی کسی چیز میں زیادتی کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔اس کا اسم فاعل ثانی اور اسم مفعول مَثْنیٰ ہوتا ہے۔اسم فاعل کا معنی ہوں گے 'دو کرنے والا' اور اسم مفعول کا معنی ہوگا 'دو کیا گیا' ۔لفظ مثْنیٰ میں یائے نسبتی لگا کر مثنوی بنا لیا گیا ہے۔اس کے معنی ہوئے ایسی چیز جس کو دو کیا گیا ہو۔لفظ مثنوی پر روشنی ڈالتے ہوئے نجم الغنی خاں رامپوری لکھتے ہیں:

''لغت میں مثنوی منسوب ہے مثنیٰ کی طرف، اور مثنیٰ میم مفتوح وسکون ثائے مثلثہ والف مقصورہ سے، دو کے معنی میں ہے۔جب یائے نسبت اس کے آخر میں لگائی گئی تو الف مقصورہ واو سے بدل گیا اور اصطلاح میں ان اشعار کو مثنوی کہتے ہیں جن میں دو مصرع باہم مقفّیٰ ہوں''

(بحر الفصاحت، نجم الغنی خاں نجمی رامپوری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۷)

اصطلاح میں مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جس کا ہر شعر ہم قافیہ یا ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔چونکہ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں اسی لئے اس کو مثنوی کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے ۔یعنی دو کیا گیا۔نیز اس کے اشعار کا باہم مربوط ہونا ضروری ہے تا کہ نظم کا تسلسل قائم رہے۔اس میں موضوع اور اشعار کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہوتی۔مثنوی ہیئت کو سمجھنے کے لئے مثنوی سحر البیان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پلا ساقیا! آخری ایک جام — کہ ہوتی ہے بس یہ کہانی تمام

وے نزدیک پہنچے جب ایک شہر کے — کیا پاس جا خیمہ اک نہر کے

کیا جبکہ خلقت نے تفتیش حال — اور آنکھوں میں دیکھا وہ بدرِ کمال

پڑا شہر میں یک بیک پھر یہ غُل — کہ غائب ہوا تھا، سو آیا وہ گل

پہلے شعر میں قافیہ ہے 'جام' دوسرے میں 'تمام' تیسرے میں 'شہر' اور ردیف ہے 'کے' اسی طرح چوتھے مصرعے میں قافیہ ہے 'نہر' اور ردیف 'کے'۔اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مثنوی کے دو شعر ہم کیا ہوتے ہیں پہلے شعر میں ردیف نہیں ہے جبکہ دوسرے شعر میں قافیے کے ساتھ ردیف بھی ہے۔مثنوی میں مردّف اشعار کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔مثنوی کی ہیئت کے تعلق سے یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ اکثر مثنوی نگاروں نے درج ذیل اجزا کو بھی مثنوی میں اہتمام کے ساتھ برتا ہے۔اگر چہ یہ مثنوی کے لئے شرط نہیں ہے۔لیکن عمومی طور پر مثنوی میں یہ اجزا پائے جاتے ہیں: حمد، نعت، منقبت، مناجات، مدح بادشاہ/امرا/وزرا، تعریف سخن یا تعریف خامہ، سبب تالیف، **اصل قصہ، اختتام۔**

مثنوی سحر البیان میں مذکورہ بالا اجزا پائے جاتے ہیں جبکہ مثنوی گلزار نسیم میں تمام اجزا نہیں پائے جاتے

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اجزا بھی مثنوی کا لازمی حصہ نہیں ہیں بلکہ یہ معاملہ مثنوی نگار کی صوابدید پر مشتمل ہے کہ وہ اپنی مثنوی میں کن اجزا کو شامل کرنا چاہتا ہے اور کس کو ترک کرنا چاہتا ہے۔

مثنوی کی بحرور

زمانہ قدیم میں مثنوی کے لئے عموماً سات بحریں مستعمل تھیں جس سے بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ ان سات بحروں کے علاوہ مثنوی نہیں کہی جاسکتی لیکن مرور زمانہ کے ساتھ صنف مثنوی نے اپنی متعینہ بحروں سے تجاوز کرتے ہوئے مختلف بحور کو اپنایا ہے جس سے اس صنف میں مزید وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ مثنوی میں اب کسی خاص بحر کا استعمال ضروری نہیں ہے۔

مثنوی کے اقسام

صنف مثنوی دوسری اصناف کے مقابلے میں زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ اس میں ہر قسم کے موضوعات کو برتا جاسکتا ہے خواہ وہ مذہبی موضوع ہو یا عشق و عاشقی کے قصے، سیاسی ہو یا معاشرتی مسائل، رزم ہو یا بزم، مناظر قدرت کی عکاسی ہو یا تاریخی واقعات کی نقشہ گری ہر ایک موضوع کو اس نے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ اس میں مضامین کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مضمون میں 'اردو مثنوی کا دکنی دور' میں مثنویوں کو چھ قسموں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ رزم نامے	۲۔ عشقیہ داستانیں	۳۔ سچی کہانیاں
۴۔ عشقیہ آپ بیتیاں	۵۔ اخلاقی اور فلسفیانہ مثنویاں	۶۔ صوفیانہ

امداد امام اثر نے مثنویوں کو موضوع کے اعتبار سے پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے: ۱۔ رزمی ۲۔ بزمی ۳۔ حکمت آموز مضامین ۴۔ تصوف آموز مضامین ۵۔ متفرق مضامین۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں' میں موضوع کے لحاظ سے مثنویوں کی چھ اقسام بتائی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) مذہبی مثنویاں (۲) تاریخی مثنویاں (۳) وہ مثنویاں جن میں ہندوستان کے معاشرتی کوائف و آثار کی تفصیل ملتی ہے۔ (۴) وہ مثنویاں جو ہندوستان کے فطری مظاہر یا موسموں کے بارے میں ہیں۔ (۵) وہ مثنویاں جن میں حب الوطنی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ (۶) ہندوستانی قصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں۔

اگرچہ مذکورہ تمام اقسام کی مثنویاں پائی جاتی ہیں لیکن یہ اس کی کوئی حتمی فہرست نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ کہ مثنویوں کے لئے موضوع کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ شاعر اپنے کسی بھی پسندیدہ موضوع کو مثنوی میں برت سکتا ہے۔ موضوع یا ہیئت کی پابندی سے مثنوی کے فن کی وسعت کو زک پہنچنے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے

جدید شعرا نے قدما کی ایسی کسی بھی پابندی کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کی ہے اور انھوں نے جدید سے جدید تر موضوع کو اپنی مثنوی میں برت کر اس صنف کو بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔

1.3.2 ہیئت اور اجزائے ترکیبی

مثنوی کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں محققین مختلف الآرا ہیں۔اس مسئلے میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ قدیم مثنویوں میں بہت سے ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جن کی رعایت بعد کی مثنویوں میں نہیں کی گئی۔قدیم مثنویوں میں ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق درج ذیل اجزا عمومی طور پر پائے جاتے ہیں:

ا۔حمد ۲۔نعت ۳۔منقبت حضرت علی اور مدح ائمہ ۴۔مربی (بادشاہ،امیر اور وزیر) کی تعریف ۵۔ تعریف سخن یا تعریف خامہ یا مناجات عاشقانہ ۶۔سبب تالیف یا وجہ تصنیف ۷۔ساقی نامہ ۸۔ اصل قصہ یا داستان ۹۔خاتمہ اس مقام پر شاعر داد سخن چاہتا ہے یا بذات خود اپنی تعریف کرتا ہے۔یہ تو قدیم مثنویوں کا خاکہ ہو گیا لیکن جدید مثنویوں میں ان مذکورہ اجزا میں سے اکثر کو نظر انداز کیا گیا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی کہ یہ اجزا مثنوی میں لازمی امور کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں بلکہ مثنوی میں جن امور کو لازمی قرار دیا گیا ہے وہ اس سے ما سوا ہیں۔یہ اجزا حسب ذیل ہیں:

ا۔پلاٹ یا قصہ ۲۔کردار نگاری ۳۔جذبات نگاری ۴۔منظر نگاری ۵۔اسلوب یا زبان و بیان۔ان تمام کی تفصیل حسب ترتیب درج کی جا رہی ہے۔

(ا) پلاٹ یا قصہ:مثنوی کے پلاٹ یا قصہ سب سے سب سے اہم جز ہے اس کے بغیر مثنوی معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔کیونکہ کسی ہیئت کو ڈھالنے کے لئے قالب کی ضرورت ہوتی ہے مثنوی کی ہیئت کو جس سانچے میں ڈھالا جاتا ہے وہ پلاٹ ہے۔پلاٹ اس نقشہ یا خاکے کو کہتے ہیں جو پوری مثنوی کو اپنی دامن میں سمیٹ کر رکھتا ہے ۔اس لئے مثنوی کا پلاٹ جتنا منظّم و مربوط ہوگا اسی قدر مثنوی کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔مثنوی میں بیان کئے جانے والے واقعات کے درمیان تسلسل کا پایا جانا ضروری ہے۔اس میں کسی بھی قسم کی بے ربطی یا بے ترتیبی مثنوی کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتی ہے جس سے قاری کے تاثر کو زک پہنچتا ہے اور مثنوی اپنی معنویت کھو دیتی ہے۔مثنوی میں ربط کے تعلق سے حالی نے بہت زور دیا ہے۔وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''پس مثنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے اور دونوں کے بیچ میں کہیں ایسا کھانچا باقی نہ رہ جائے کہ جب تک کچھ عبارت مقدر نہ مانی جائے،تب تک کلام،جیسا کہ چاہیے،مربوط اور منظّم نہ ہو۔''

(مقدمہ شعر و شاعری،الطاف حسین حالی،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی،۲۰۱۳ء،ص ۲۰۵)

اس اقتباس سے یہ مبرہن ہو جاتا ہے کہ مثنوی کے لئے ربط وتسلسل ایک مرکزی رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ پلاٹ کا یہی کام ہے کہ وہ مثنوی کے اشعار وابیات اور میں بیان ہونے والے مرحلہ وار قصے یا واقعے کے درمیان ربط کو قائم رکھے۔

(۲) کردار نگاری: مثنوی ایک بیانیہ صنف سخن ہے اور میں کسی واقعے یا قصے کو بیان کیا جاتا ہے اور ہر واقعے یا قصے کے وقوع کے لئے کردار کا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے ہر حرکت کے لئے محرّک کا ہونا لابدی ہے ۔ چنانچہ اسی کے پیش نظر مثنوی میں کردار نگاری کو بہت اہم مانا جاتا ہے۔ کردار نگاری کے لئے مثنوی نگار کا جز رس ہونا ضروری ہے تبھی حقیقی معنوں میں واقعے اور کردار کے درمیان ربط پیدا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح مثنوی میں کوئی بھی کردار نگاری اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب مثنوی میں کرداروں کی عمر، صلاحیت، ماحول، معاش اور دیگر خصوصیات کے مطابق ان سے کام لیا جائے تو ایسے کردار قصے کو آگے بڑھانے میں مدد فراہم کرتے ہیں اور اگر واقعے کی رعایت سے کرداروں کی صلاحیتوں کے مطابق کام نہ لیا جاسکے تو یہ کردار نگاری کو کمزور کرتا ہے جس سے مثنوی میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ کردار نگاری کے اوصاف کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

'' پلاٹ کے علاوہ کردار نگاری پر بھی بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔ خاص خاص کرداروں کو امتیازی خصوصیات کا مالک ہونا چاہیے۔ ایک کردار کا لب ولہجہ طرز فکر عمل انداز قد دوسرے کردار سے مختلف ہونا چاہیے کیوں کہ زندگی میں یہی ہوتا ہے۔ مثنوی میں وہی کردار جاذب نظر اور مورد توجہ ہوتے ہیں جن میں کوئی وصف مثلاً شوخی، ذکاوت وفطانت، وفاداری، انسانی ہمدردی، ایثار، رحم، بغض، کینہ، بے وفائی وغیرہ شدت سے ہوں۔''

(اردو مثنوی شمالی ہند میں، ڈاکٹر گیان چند جین، انجمن ترقی ہند، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۸۳)

مذکورہ حوالے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کردار نگاری مثنوی کا اہم جز ہے۔ ایک اچھے اور کامیاب مثنوی نگار کے لئے یہ لازم ہے وہ کرداروں کے اوصاف وعادات سے بخوبی واقف ہو اور اسی کے لحاظ سے وہ کرداروں کو عمل میں لائے۔ کردار نگاری کے لئے یہ ضروری ہے کردار حقیقت سے قریب تر ہوں اور وہ مثنوی میں پوری طرح سے رچے بسے ہوں۔ اسی طور پر کردار نگاری کامیاب ہوسکتی ہے۔

(۳) جذبات نگاری: جذبات نگاری بھی مثنوی کے کرداروں کو آگے بڑھانے اور مثنوی میں زور پیدا کرنے کے لئے نہایت اہم ہے۔ ایک کامیاب مثنوی کے لئے ضروری ہے کے اس میں پائے جانے والے کرداروں کے جذبات کو حقیقی اور فطری انداز میں بیان کیا جائے۔ تاکہ قاری پر بھی وہی جذبات طاری ہوسکیں اور وہ اس کے تاثر کو قبول کر سکے۔ جذبات نگاری کے لئے مثنوی نگار کا دروں بیں اور نفسیاتی مسائل سے واقف ہونا از حد ضروری ہے۔ کیونکہ بہترین جذبات نگاری ہی مثنوی کو دلچسپ بناتی ہے۔

(۴) منظر نگاری: منظر نگاری جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے کہ کسی مکان، زمان اور حالت کی فطری

اور حقیقی تصویر کشی کو کہا جاتا ہے۔ کسی بھی منظر نگاری کو اسی حالت میں کامیاب کہا جاسکتا ہے جب کہ وہ مبنی بر حقیقت ہو اور اس کو بہت ہی چابکدستی کے ساتھ بڑے ہی دلپذیر انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ ایک حقیقی مثنوی نگار اپنی منظر نگاری سے ایسا سماں باندھ دیتا ہے کہ تمام مناظر کی تصاویر قاری کے آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں اور وہ ان میں محو ہوجاتا ہے۔ حقیقی منظر نگاری جمالیاتی کیفیت کو انگیز کرتی ہے اور قصے کو آگے بڑھانے میں مدد فراہم کرتی ہے۔

(۵) زبان و بیان اور اسلوب: نظم ہو یا نثر کسی بھی تخلیق کے لئے اسلوب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسلوب کا دارومدار زبان و بیان پر منحصر ہے۔ مثنوی کی زبان جتنی سادہ، سلیس اور موثر ہوگی انداز بیان اور اسلوب میں اتنی ہی دلکشی پیدا ہوجائے گی۔ اس سلسلے ڈاکٹر گیان چند جین اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معنی اور بیت (کذا ہیئت) کی بحث میں بہترین مسلک یہی ہے کہ کسی ایک کا حسین ہونا کافی نہیں۔ معنی کے ساتھ طرزِ اظہار بھی دلکش ہونا چاہیے۔ جملیاتی پہلو طرزِ اظہار اور اسلوب بیان سے زیادہ وابستہ ہے۔ اگر ظاہر خراب ہوگا تو باطن کا حسن گدڑی کے لال (کذا لعل) کی طرح پوشیدہ رہے گا۔ اچھی مثنوی کی زبان نہایت صاف اور رواں ہونی چاہیے۔ جذبات نگاری اور شستہ زبان یہی دو خاص اوصاف ہیں جن پر مثنوی کے مرتبہ کا انحصار ہوتا ہے۔''

(اردو مثنوی شمالی ہند میں، ڈاکٹر گیان چند جین، انجمن ترقی ہند، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۸۱۔۸۲)

زبان و بیان اور اسلوب کی دلکشی ہی دراصل مثنوی کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے اردو زبان کے اصول ومبادی کا مکمل خیال نہ رکھا جائے تو کبھی کوئی موثر اسلوب وجود پذیر ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے مثنوی کی زبان کو نہایت صاف شستہ اور رواں ہونا چاہے تاکہ قاری اسلوب کی روانی کے ساتھ بہتا چلا جائے اور اس کے تاثر اور تسلسل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ یہی ایک اچھے اسلوب کی نشانی ہے اور اسی سے کوئی مثنوی کامیاب ترین ہوتی ہے۔

1.3.3 دیگر اصناف سے امتیاز

مثنوی ایک بیانیہ صنف سخن ہے۔ اس میں کسی داستان، قصے یا واقعے کو اس کی تمام جزئیات کے ساتھ بیان کرنے کی آزادی ہے اسی لئے شاعری کے اکثر نقادوں صنف مثنوی کی بہت تعریف کی ہے اس کو سب سے مفید اور کارآمد صنف گردانا ہے۔ مثنوی ہیئت اور موضوع دونوں اعتبار سے وسیع ترین صنف سخن ہے۔ اس میں شاعر کو ہیئتی اعتبار سے ردیف و قافیہ کی صرف اس قدر پابندی لازمی ہے کہ ہر شعر ایک ہی قافیہ یا قافیہ و ردیف ہو اور ہر شعر کے ساتھ قافیہ یا قافیہ و ردیف بدل جاتا ہے۔ مثنوی میں عموماً مردف اشعار بہت ہی کم ملتے ہیں۔ اس سے شاعر کو ایک قسم کی آزادی مل جاتی ہے کہ اسے ایک شعر صرف دونوں مصرعوں کو ہم قافیہ لانا ہوتا ہے جب کہ اس

کے برعکس غزل کے تمام اشعار میں قافیہ کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔اسی طرح اگر موضوع کو مدنظر رکھا جائے تو زیادہ تر اصناف مخصوص قسم کے موضوعات کے ساتھ خاص مناسبت رکھتی ہیں جیسے مرثیہ اور قصیدہ وغیرہ کے موضوع بہت محدود ہیں۔مثنوی میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔

ذیل میں ہم کچھ اصناف کے ساتھ مثنوی کا تقابل کر کے اس کی صنفی خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے الطاف حسین حالی کی رائے ملاحظہ کرتے ہیں جو انھوں نے مثنوی کی صنفی خصوصیات کے تعلق ظاہر کی ہے۔اس میں انھوں نے دیگر اصناف کے حدود و قیود کو واضح کیا ہے اور مثنوی کے تسلسل بیان کی خصوصیت کی تعریف کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بہ کار آمد صنف ہے۔کیوں کہ غزل یا قصیدے میں اس وجہ سے کہ اوّل سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے، ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔مسدس میں یہ دقّت ہے کہ ہر بند میں چار قافیے ایک طرح کے اور دو ایک طرح کے لانے پڑتے ہیں۔پس اس میں مسلسل مضامین ایسی خوبی سے بیان کرنے کہ مطالب برابر بے کم و کاست ادا ہوتے چلے جائیں اور قافیوں کی نشست اور روزمرّہ کا سررشتہ ہاتھ سے نہ جائے، ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ترجیع بند بھی مسلسل مضامین کی گوں نہیں ہے کیوں کہ اس میں ہر بند کے آخر میں وہی ایک ترجیع کا شعر بابا آتا ہے جو سلسلہ کلام کو منقطع کر دیتا ہے۔ترکیب بند کے اگر تمام بیتوں کی تعداد برابر رکھی جائے تو بھی ایسی ہی دقت پیش آتی ہے کیوں کہ اس کے ایک ہی بند میں صرف ایک پوائنٹ عمدگی سے بیان ہوسکتا ہے لیکن ہر پوائنٹ کی وسعت یکساں نہیں ہوتی بلکہ کم وبیش ہوتی ہے۔پس ضرور ہے کہ بند بھی چھوٹے بڑے ہوں۔ممکن ہے کہ ایک بند، دو تین بہت کا ہو اور دوسرا، پندرہ بیس بہت کا۔اور یہ بات اس تناسب کے برخلاف ہے جو شعر کا جزوِ اعظم ہے۔

الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں، ان میں کوئی صنف، مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل، مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔''

(مقدمہ شعر و شاعری، خواجہ الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۲۰۲۔۲۰۳)

محولہ بالا اقتباس میں حالی نے مثنوی کے سب سے اہم وصف تسلسل بیان کو مرکز میں رکھ کر کئی شعری اصناف کی اس کمزوری کو واضح کیا ہے کہ مذکورہ اصناف تسلسل بیان کی خصوصیت سے عاری ہیں۔اس کے علاوہ اگر مثنوی کا تقابل کن ہی دو اصناف سے کیا جا سکتا ہے تو وہ قصیدہ اور مرثیہ ہیں۔اس سلسلے میں پروفیسر عقیل رضوی نے تفصیل کے ساتھ مثنوی کا ان دو اصناف سے مقابلہ کر کے کچھ نکات بیان کئے جن کو یہاں اختصار کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

قصیدہ اور مثنوی: قصیدہ اور مثنوی کے درمیان پہلا فرق ہیئتی ہے۔''قصیدہ میں ہر مصرع مطلعوں کے

علاوہ، دوسرے مصرعے کے قافیہ اور ردیف سے الگ ہوتا ہے اور پورے قصیدہ کے آخری مصرعے صرف ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مثنوی میں اس کے برعکس ہر شعر اپنے قافیہ سمیت الگ ہوتا ہے صرف ماقبل کے اشعار مابعد کے اشعار سے منسلک ہوتے ہیں۔

۲۔ قصیدہ اور مثنوی میں موضوعات کا فرق بھی پایا جاتا ہے قصیدے کے موضوعات محدود ہیں جو مدح، ذم اور شکوہ سے آگے نہیں بڑھ پاتے نیز اس میں مثنوی کی طرح وسعت بھی نہیں ہوتی جو بہت سے موضوعات کا احاطہ کر سکے۔ مثنوی میں ایسی کوئی قید نہیں ہوتی اس میں ہر قسم کے موضوعات کو مکمل جزئیات کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ قصیدہ بھی اپنی اصل میں ایک خاص قسم کی نظم ہوتا ہے مگر اس میں اور مثنوی میں بنیادی فرق ہے کہ عام طور پر قصیدے میں کچھ اجزا کی پابندی پائی جاتی مثلاً تشبیب، گریز، مدح و ذم، دعا یا خاتمہ۔ اگر چہ خطابیہ قصیدے اس سے مبرا ہیں۔ مذکورہ اجزا میں یہ پابندی بھی پائی جاتی ہے کہ اس کے اشعار میں ایک خاص تناسب ضروری ہے جیسے تشبیب کے اشعار مدح سے زیادہ نہ ہوں۔ گریز کے اشعار چار پانچ شعر سے زیادہ نہ ہوں وغیرہ جب کہ مثنوی عناوین اور عناوین کے تحت اشعار کی تعداد جیسی پابندیوں سے آزاد ہے۔

۴۔ قصیدہ میں اشعار کی تعداد ایک معینہ حد سے تجاوز نہیں کر پاتی اسی وجہ موضوع کی تحدید اور قافیہ کی پابندی بنیادی وجہ ہیں۔ اس لئے بڑے سے بڑے شاعر کے لئے دوسو اشعار سے زیادہ کا قصیدہ کہنا بھی بہت مشکل ہے۔

۵۔ قصیدہ ایک بزمیہ صنف جس کے لئے طوالت خود ایک نقص ہے کیوں کہ سامع بڑے قصیدے سے اکتا جاتا ہے۔ اس لئے بھی اس میں اطناب کی زیادہ گنجائش نہیں پائی جاتی۔ اس کے برخلاف مثنوی بزمیہ صنف نہیں اس لئے اس میں طوالت کی پوری گنجائش پائی جاتی ہے۔

مرثیہ اور مثنوی: قصیدہ کے مقابلے میں مرثیہ مثنوی کے سب سے قریب ترین صنف مانی جاسکتی ہے لیکن اس میں کچھ حدود و قیود نے بھی اس صنف میں بہت زیادہ وسعت پیدا ہونے پر پابندی لگا دی ہے۔ جن کا ذکر اختصاراً یہاں کیا جارہا ہے۔

۱۔ مرثیہ ایک بزمیہ صنف ہے۔ اس لئے اس میں طوالت کی بہت زیادہ گنجائش نہیں پائی جاتی ورنہ سامعین اس سے اکتا جائیں گے۔

۲۔ قصیدہ کی طرح مرثیہ میں بھی عموماً کمی بیشی کے ساتھ کچھ اجزا کی پابندی کو لازم سمجھا جاتا ہے۔ یہ حسب ذیل ہیں:

چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین۔ ان اجز کی پابندی نے مرثیہ کو محدود کر دیا ہے

۔اس لئے وہ مثنوی کی طرح طول وطویل نہیں ہوسکتا۔اسی طرح مرثیہ میں بین کے بعد کچھ نہیں لکھا جا سکتا لیکن مثنوی میں ایک قصہ کے اختتام کے بعد نیا قصہ شروع کیا جا سکتا ہے

۳۔موضوع کے لحاظ سے بھی مثنوی کے مقابلے میں مرثیہ کا میدان بہت تنگ ہے۔وہ کربلا کے تاریخی واقعہ تک محدود رہتا ہے۔مرثیہ کی شروعات میں کسی نئے موضوع کو اگر برتا بھی جائے تو بھی اس کو اختصار کے ساتھ ہی بیان کیا جا سکتا ہے کیونکہ مرثیہ کا اصل مقصد واقعے کربلا کو ہی پیش کرنا ہوتا ہے۔اس لئے کسی خارجی موضوع کو بہت طوالت دینے سے اصل مقصد کے فوت ہونے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔جب کہ مثنوی میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔

۴۔مرثیہ اور مثنوی دونوں میں عموماً مافوق الفطرت چیزوں کا بیان پایا جاتا ہے لیکن اس میں فرق یہ کہ مثنوی میں فوق الفطرت عناصر کو مثنوی نگار قصے کے مطابق جیسے چاہے ڈھال سکتا ہے۔جب کہ مرثیہ کے مافوق الفطرت چیزیں روایت اور نقل کے طابع ہوتی ہیں مرثیہ نگار کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے کہ وہ روایت سے تجاوز کر سکے۔

۵۔کردار نگاری کا جز مثنوی اور مرثیہ دونوں میں پایا جاتا ہے لیکن مراثی میں مثنوی کے مقابلے میں کرداروں کو زیادہ بہتر اور مکمل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔مرثیہ کی یہ خصوصیت ارادی طور پر ان مقدس شخصیات کے پیش نظر عقیدت کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔مثنوی میں بھی اگر کردار نگاری پر توجہ دی جائے تو اچھے نمونہ پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن ابھی تک کردار نگاری میں مثنوی مرثیہ سے بہت پیچھے ہے۔

1.3.4 حاصل مطالعہ

مثنوی ایک طویل صنف سخن ہے جس میں کوئی قصہ یا واقعہ بہت ہی منظّم انداز میں ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیا جائے۔اس میں خیال مربوط ہوں بات سے بات نکلے قصہ در قصہ آگے بڑھے۔مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس میں ہر قسم کے موضوعات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔خواہ اس کا تعلق کسی بھی میدان سے ہو۔اس میں رزم و بزم،اخلاق و فلسفہ،تاریخ و افسانہ اور عشق و عاشقی وغیرہ ہر قسم کے مضامین منظّم انداز میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔ مثنوی کا فن توضیح و وضاحت کا فن ہے اس میں غزل کی طرح رمز و کنایہ اور اختصار کا انداز نہیں اپنایا جاتا بلکہ ہر واقعے کو صراحت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے تا کہ قاری کسی طرح کے ابہام کا شکار نہ ہو اور نہ اس کے تاثر میں کمی واقع ہو۔مثنوی میں ربط و تسلسل کے لئے پلاٹ کا استعمال کیا جاتا ہے ایک اچھا پلاٹ اچھی مثنوی کا ضامن ہوتا ہے اور قصے کو آگے بڑھانے کے لئے کردار وضع کئے جاتے ہیں۔ان کرداروں میں کو حقیقت سے قریب تر کرنے کے لئے ان کے جذبات اور ماحول کی عکاسی بھی کی جاتی ہے۔کردار اور جذبات کی ترجمانی کے لئے زبان و بیان اور اسلوب پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔کیوں کہ ایک اچھی مثنوی میں زبان و بیان کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی

ہے ۔مثنوی میں حسب ذیل اجزائے ترکیبی کی رعایت کی جاتی ۔ پلاٹ، کردار، جذبات نگاری اور اسلوب بیان سے مل کر ایک مثنوی تشکیل پاتی ہے۔مثنوی میں تسلسل وارتباط کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے ۔ایک کامیاب مثنوی کے لئے اس کے تمام اجزائے ترکیبی پر توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

مثنوی کی پہلی خصوصیت پلاٹ ہے۔ پلاٹ جس قدر مربوط و منظّم ہوگا مثنوی اسی قدر کامیاب ہوگی اگر پلاٹ میں کسی طرح کی کمزوری اور جھول ہوگا تو مثنوی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکے گی ۔مثنوی کی دوسری خاصیت کردار نگاری ہے۔کردار نگاری میں جس قدر کرداروں کے ماحول، معاش، معاشرے اور ان کی حیثیتوں کا خیال رکھا جائے گا اسی لحاظ سے مثنوی آگے بڑھے گی ۔اگر مثنوی کے کردار کمزور ہوں تو مثنوی کی ترقی میں رکاوٹ آجاتی ہے ۔اس لئے مثنوی میں کردار نگاری کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے ۔مثنوی کی تیسری خصوصیت جذبات نگاری ہے ۔کردار نگاری کے لحاظ سے اس کی اہمیت کلیدی ہو جاتی ہے ۔اگر جذبات نگاری پر توجہ نہ دی جائے تو مثنوی کے کردار صحیح طور پر ابھر نہیں پاتے ۔مثنوی کی چوتھی خصوصیت زبان و بیان اور اسلوب ہے ۔مثنوی کی زبان جتنی سہل اور سادہ ہوگی اس کا اسلوب اتنا ہی دلچسپ ہوگا اور قاری اس کی روانی کے ساتھ بہتا چلا جائے گا ۔زبان کے استعمال میں روزمرہ اور محاوروں کا خیال رکھا جائے تو مثنوی میں لطف پیدا ہو جاتا اور قاری مثنوی سے پوری طرح سے محظوظ ہوسکتا ہے ۔ایک کامیاب مثنوی کے تمام اجزائے ترکیبی پر توجہ صرف کرنا ضروری ہے کسی بھی پہلو میں سقم ہو تو مثنوی معیار سے گر جاتی ہے۔

مثنوی کا فن دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بسیط، مرتب اور کسی قدر پیچیدہ ہے ۔طویل ہونے کی وجہ سے جہاں اس میں بہت سی آزادیاں ہیں وہیں اس کی طوالت کو سنبھالنا بھی ایک مشکل عمل ہے شاعر میں اگر اپج نہ ہو تو طویل مثنوی اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے بے رنگ ہو جاتی ہے اور کی طوالت قاری کے لئے بوجھ کے سوا کچھ نہیں ہوتا ۔مثنوی کے فن نے قدیم زمانے میں اردو ادب میں کافی ترقی کی تھی مگر جدید دور میں اس میں کچھ کمی پیدا ہوگئی اب کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے بہت کم مثنویاں منظر عام پر دکھائی دیتی ہیں جس کی توجہ کرنے کی ضرورت ہے ۔لیکن مثنوی کا فن اتنا مستحکم ہے اور اس روایت اتنی مضبوط ہے کہ یہ کبھی مٹ نہیں سکتی نہ اس کی اہمیت کبھی ختم ہوسکتی ہے۔

1.4 آپ نے کیا سیکھا

مثنوی کی لغوی و اصطلاحی تریف سے آگہی حاصل کی۔

مثنوی کے اقسام کو سمجھا۔

مثنوی کے اجزائے ترکیبی سے آشنائی حاصل کی۔

مثنوی کا دیگر اصناف سخن سے مقابلہ کر کے اس کی خصوصیات و امتیازات سے واقفیت حاصل کی۔

1.5 اپنا امتحان خود کیجئے

1. مثنوی کے لغوی و اصطلاحی تعریف بیان کیجیے؟
2. مثنوی کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہیں؟
3. مثنوی میں پلاٹ سے مراد کیا ہے؟
4. مثنوی کے فن پر اختصار سے روشنی ڈالیے؟

مثنوی اور مرثیہ کے درمیان فرق کو مختصراً واضح کیجیے؟

1.6 سوالات کے جوابات

1. مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے۔لفظ مثنوی 'ثَـنَـی' سے مشتق ہے جس کا مادہ 'ث،ن،ی' ہے۔اس کے لغوی معنی ہیں دو کرنا، دوہرا کرنا یا تہہ کرنا۔یعنی کسی چیز میں زیادتی کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔اس کا اسم فاعل ثـانـی اور اسـم مفعول مَثْنیٰ ہوتا ہے جس کے معنی ہیں اسم فاعل کا معنی ہوگا 'دو کرنے والا' اور اسم مفعول کا معنی ہوگا 'دو کیا گیا'۔اسی لفظ مَثْنیٰ میں یائے نسبتی لگا کر لفظ مثنوی بنا لیا گیا ہے۔اس کے معنی ہوئے ایسی چیز جس کو دو کیا گیا ہو۔

اصطلاح میں مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جس کا ہر شعر ہم قافیہ یا ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں اسی لئے اس کو مثنوی کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے ۔یعنی دو کیا گیا۔نیز اس کے اشعار کا باہم مربوط ہونا ضروری ہے تاکہ نظم کا تسلسل قائم رہے۔اس میں موضوع اور اشعار کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہوتی۔

2. مثنوی کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں محققین مختلف الآرا ہیں۔اس مسئلے میں صحیح ترین بات یہ ہے کہ قدیم مثنویوں میں بہت سے ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جن کی رعایت بعد کی مثنویوں میں نہیں کی گئی۔قدیم مثنویوں میں ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق درج ذیل اجزا عمومی طور پر پائے جاتے ہیں:

۱۔حمد ۲۔نعت ۳۔منقبت حضرت علی اور مدح ائمہ ۴۔مربی (بادشاہ، امیر اور وزیر) کی تعریف ۵۔تعریف سخن یا تعریف خامہ یا مناجات عاشقانہ ۶۔سبب تالیف یا وجہ تصنیف ۷۔ساقی نامہ ۸۔اصل قصہ یا داستان ۹۔خاتمہ اس مقام پر شاعر داد سخن چاہتا ہے یا بذات خود اپنی تعریف کرتا ہے۔یہ تو قدیم مثنویوں کا خاکہ ہو گیا لیکن جدید مثنویوں میں ان مذکورہ اجزا میں سے اکثر کو نظر انداز کیا گیا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی کہ یہ اجزا مثنوی کے لازمی امور کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں بلکہ مثنوی میں جن امور کو لازمی قرار دیا گیا ہے وہ اس سے ما سوا ہیں۔یہ اجزا حسب ترتیب ہیں:

۱۔پلاٹ یا قصہ ۲۔کردار نگاری ۳۔جذبات نگاری ۴۔منظر نگاری ۵۔اسلوب یا زبان و بیان۔

3. پلاٹ یا قصہ: مثنوی کے پلاٹ یا قصہ سب سے سب سے اہم جز ہے اس کے بغیر مثنوی معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ کسی ہیئت کو ڈھالنے کے لئے قالب کی ضرورت ہوتی ہے مثنوی کی ہیئت کو جس سانچے میں ڈھالا جاتا ہے وہ پلاٹ ہے۔ پلاٹ اس نقشہ یا خاکے کو کہتے ہیں جو پوری مثنوی کو اپنی دامن میں سمیٹ کر رکھتا ہے۔اس لئے مثنوی کا پلاٹ جتنا منظّم و مربوط ہوگا اسی قدر مثنوی کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔مثنوی میں بیان کئے جانے والے واقعات کے درمیان تسلسل کا پایا جانا ضروری ہے۔اس میں کسی بھی قسم کی بے ربطی یا بے ترتیبی مثنوی کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتی ہے جس سے قاری کے تاثر کو زک پہنچتا ہے اور مثنوی اپنی معنویت کھو دیتی ہے۔ مثنوی کے لئے ربط و تسلسل ایک مرکزی رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔چنانچہ پلاٹ کا یہی کام ہے کہ وہ مثنوی کے اشعار و ابیات اور میں بیان ہونے والے مرحلہ وار قصے یا واقعے کے درمیان ربط کو قائم رکھے۔

4. مثنوی ایک طویل صنف سخن ہے جس میں کوئی قصہ یا واقعہ بہت ہی منظّم انداز میں ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیا جائے۔اس میں خیال مربوط ہوں بات سے بات نکلے قصہ در قصہ آگے بڑھے۔مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں ہر قسم کے موضوعات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔خواہ اس کا تعلق کسی بھی میدان سے ہو۔اس میں رزم و بزم، اخلاق و فلسفہ، تاریخ و افسانہ اور عشق و عاشقی وغیرہ ہر قسم کے مضامین منظّم انداز میں بیان کئے جاسکتے ہیں۔مثنوی کا فن توضیح و وضاحت کا فن ہے اس میں غزل کی طرح رمز و کنایہ اور اختصار کا انداز نہیں اپنایا جاتا بلکہ ہر واقعے کو صراحت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے تاکہ قاری کسی طرح کے ابہام کا شکار نہ ہو اور نہ اس کے تاثر میں کمی واقع ہو۔مثنوی میں ربط و تسلسل کے لئے پلاٹ کا استعمال کیا جاتا ہے ایک اچھا پلاٹ اچھی مثنوی کا ضامن ہوتا ہے اور قصے کو آگے بڑھانے کے لئے کردار وضع کئے جاتے ہیں۔ان کرداروں میں کو حقیقت سے قریب تر کرنے کے لئے ان کے جذبات اور ماحول کی عکاسی بھی کی جاتی ہے۔کردار اور جذبات کی ترجمانی کے لئے زبان و بیان اور اسلوب پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔کیوں کہ ایک اچھی مثنوی میں زبان و بیان کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔مثنوی میں حسب ذیل اجزائے ترکیبی کی رعایت کی جاتی۔ پلاٹ، کردار، جذبات نگاری اور اسلوب بیان سے مل کر ایک مثنوی تشکیل پاتی ہے۔مثنوی میں تسلسل و ارتباط کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔ایک کامیاب مثنوی کے لئے اس کے تمام اجزائے ترکیبی پر توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۔مرثیہ ایک بزمیہ صنف ہے۔اس لئے اس میں طوالت کی بہت زیادہ گنجائش نہیں پائی جاتی ورنہ سامعین اس سے اکتا جائیں گے۔

۲۔قصیدہ کی طرح مرثیہ میں بھی عموماً کمی بیشی کے ساتھ کچھ اجزا کی پابندی کو لازم سمجھا جاتا ہے۔یہ حسب ذیل ہیں:

چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین۔ان اجز کی پابندی نے مرثیہ کو محدود کر دیا ہے

۔اس لئے وہ مثنوی کی طرح طول وطویل نہیں ہوسکتا۔اسی طرح مرثیہ میں بین کے بعد کچھ نہیں لکھا جا سکتا لیکن مثنوی میں ایک قصہ کے اختتام کے بعد نیا قصہ شروع کیا جا سکتا ہے

۳۔موضوع کے لحاظ سے بھی مثنوی کے مقابلے میں مرثیہ کا میدان بہت تنگ ہے۔وہ کربلا کے تاریخی واقعہ تک محدود رہتا ہے۔مرثیہ کی شروعات میں کسی نئے موضوع کو اگر برتا بھی جائے تو بھی اس کو اختصار کے ساتھ ہی بیان کیا جا سکتا ہے کیونکہ مرثیہ کا اصل مقصد واقعے کربلا کو ہی پیش کرنا ہوتا ہے۔اس لئے کسی خارجی موضوع کو بہت طوالت دینے سے اصل مقصد کے فوت ہونے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔جب کہ مثنوی میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔

۴۔مرثیہ اور مثنوی دونوں میں عموماً مافوق الفطرت چیزوں کا بیان پایا جاتا ہے لیکن اس میں فرق یہ کہ مثنوی میں فوق الفطرت عناصر کو مثنوی نگار قصے کے مطابق جیسے چاہے ڈھال سکتا ہے۔جب کہ مرثیہ کے مافوق الفطرت چیزیں روایت اور نقل کے طابع ہوتی ہیں مرثیہ نگار کو یہ آزادی حاصل نہیں ہے کہ وہ روایت سے تجاوز کر سکے۔

5. کردار نگاری کا جز مثنوی اور مرثیہ دونوں میں پایا جاتا ہے لیکن مراثی میں مثنوی کے مقابلے میں کرداروں کو زیادہ بہتر اور مکمل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔مرثیہ کی یہ خصوصیت ارادی طور پر ان مقدس شخصیات کے پیش نظر عقیدت کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔مثنوی میں بھی اگر کردار نگاری پر توجہ دی جائے تو اچھے نمونہ پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن ابھی تک کردار نگاری میں مثنوی مرثیہ سے بہت پیچھے ہے۔

1.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
مثنوی	دو دو والا، ایک صنف سخن جس میں تسلسل کے ساتھ کوئی واقعہ بیان کیا جائے۔اس میں ہر شعر کا قافیہ الگ لیکن ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔اس میں اشعار کی تعداد متعین نہیں۔ہوتی۔
رزمیہ	جنگ سے متعلق
بزمیہ	مجلس یا دربار سے متعلق
رمز	پہیلی، اشارہ، راز، بھید
مستعار	ادھار لینا
بام عروج	بلندی پر
شاہد	گواہ

عادل	انصاف کرنے والا
مربوط	جڑا ہوا
معرضِ وجود	ظاہر ہونا، سامنے آنا
قالب	سانچا، ڈھانچا
زک	گھاٹا، نقصان
مقدر	قسمت، پوشیدہ چیز
محرّک	ہلانے والا، حرکت دینے والا
لابدی	ضروری، جس کے بغیر چارہ نہ ہو، لازمی
جزرس	تہہ تک پہنچنے والا، سمجھدار
انگیز	اٹھانا، ابھارنا، جوش دلانا

1.8 کتب برائے

1. اردو مثنوی کا ارتقاء شمالی ہند میں	سید محمد عقیل رضوی
2. اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین
3. اردو مثنوی کا ارتقا	عبدالقادر سروری
4. اردو کی تین مثنویاں	رشید حسن خاں
5. جدید اردو مثنوی فن اور فکری ابعاد	ظفر انصاری ظفرؔ

اکائی 2. مثنوی کا فن۔ ہیئت اور اجزائے ترکیبی۔ دیگر اصناف سخن سے امتیاز

2.1 اغراض و مقاصد
2.2 تمہید
2.3 اردو مثنوی نگاری کا آغاز و ارتقا (دکن و شمال کے خصوصی حوالے سے)
2.3.1 دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا
2.3.2 شمال میں اردو مثنوی کا ارتقا
2.3.3 حاصل مطالعہ
2.4 آپ نے کیا سیکھا
2.5 اپنا امتحان خود کیجئے
2.6 سوالات کے جوابات
2.7 کلیدی الفاظ
2.8 کتب برائے مطالعہ

2.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ
اردو مثنوی کے آغاز و ارتقا سے واقف ہوں گے۔
دکن میں اردو مثنوی کے آغاز و ارتقا سے آشنا ہوں گے۔
شمال میں اردو مثنوی کے آغاز و ارتقا سے واقفیت حاصل کریں گے۔

2.2 تمہید

طلبائے گرامی! گزشتہ اکائی میں آپ نے مثنوی کے فن اس کی ہیئت، اجزائے ترکیبی، اس کے موضوعات اور دیگر اصناف کے مقابلے میں اس کے امتیازات سے آگہی حاصل کی۔ مثنوی کا کی صنف کا آغاز دکن میں ہوا پھر وہاں سے یہ شمالی ہند میں پہنچا چنانچہ دونوں خطوں میں مثنوی کے قابل قدر نمونے ملتے ہیں۔ اس اکائی میں ہم دکن اور شمال دونوں مقامات میں مثنوی کے آغاز و ارتقا سے بحث کر کے اس کے قابل قدر نمونوں سے آشنائی

حاصل کریں گے۔

2.3 اردو مثنوی نگاری کا آغاز وارتقا (دکن وشمال کے خصوصی حوالے سے)

2.3.1 دکن میں اردو مثنوی کا آغاز وارتقا

مثنوی اردو کی معروف ترین صنف سخن ہے جو فارسی زبان سے اردو میں آئی۔ فارسی میں مثنوی کے بہت ہی عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ شاہ نامہ اور مثنوی معنوی کا شمار دنیا کی عظیم ترین تخلیقات میں ہوتا ہے۔ اسی سے متاثر ہوکر اردو میں بھی ابتدا سے مثنوی نگاری کی صنف میں طبع آزمائی کی جانے لگی تھی۔ مثنوی چونکہ ایک بیانیہ صنف ہے اس میں کسی بھی موضوع پر پوری آزادی کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی صلاحیت پائی جاتی اس لئے بھی شعرا نے اولین دور اس صنف میں کچھ نہ کچھ تحریر کرنا شروع کر دیا تھا۔ مرور زمانہ کے ساتھ اس صنف نے خوب ترقی کی اور شعرا نے اس میں ایک بیش بہا خزانہ چھوڑا ہے جو اردو ادب کا عظیم سرمایہ ہے۔ قدیم ادب میں مثنوی کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے اردو کے تمام بڑے شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور انھوں اس میں اپنے حالات زندگی سے لیکر سماج معاشرے، جنگی وقائع اور ہر قسم کے مسائل کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مثنوی ایک طویل صنف سخن ہے اس کا یہ فائدہ ہے کہ کوئی بھی واقعہ اپنی تمام جزئیات کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتا ہے جس سے قاری کو اس زمانے کے حالات تاریخ، معاشرت اور زبان و بیان کے بارے میں کافی معلومات فراہم ہوجاتی ہیں۔

اردو میں مثنوی نگاری کا آغاز سے دکن سے ہوتا ہے۔ اردو کا پہلا مثنوی نگار فخر دین نظامی کو قرار دیا گیا ہے اور ان کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کو اردو کی پہلی مثنوی تسلیم کیا گیا ہے۔ نظامی نے یہ مثنوی بہمی سلطنت کے نویں بادشاہ شہاب الدین احمد شاہ ولی کے دور میں تحریر کی۔ اس مثنوی میں ہندوستانی تہذیب کی چھاپ قصہ سے لے کر کرداروں تک میں نظر آتی ہے۔ نظامی کے بعد میراں جی شمس العشّاق جن کا تعلق صوفیہ سے ہے۔ انھوں نے 'خوش نامہ' کے عنوان سے ایک مذہبی مثنوی لکھی ہے۔ نیز 'خوش نغز' اور 'شہادۃ الحقیقت' نامی مثنویاں بھی ان ہی کی ذات سے منسوب ہیں۔ میراں جی کی تمام مثنویاں تصوف وشریعت کے نکات ومباحث پر مبنی ہیں۔ علاوہ ازیں بہمنی دور میں اشرف بیابانی کا نام بطور مثنوی نگار اہمیت کا حامل ہے۔ اشرف کی تخلیقات میں 'نوسرہار' 'واحد باری اور 'لازم المبتدی ہیں۔ لازم المبتدی میں مرد وعورت کے متعلق شرعی احکامات بیان کئے گئے ہیں۔ واحد باری امیر خسرو کی خالق باری کے طرز لکھی گئی ہے۔ ان کی تخلیقات میں سب سے اہم 'نوسرہار' ہے۔ اس مثنوی میں واقعات کربلا کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک طویل مثنوی جس میں ۱۸۰۰ اشعار ہیں اس میں مذہب وعشق کے علاوہ رزمیہ موضوع بھی پائے جاتے ہیں۔ بہمنی دور میں مثنوی کے تعلق سے یہی تین نام سب سے اہم ہیں۔ بہمی سلطنت کے زوال کے بعد جب پانچ ریاستیں قائم ہوئیں تو ان میں سے جن دو ریاستوں نے اردو ادب کے فروغ

میں نمایاں کردار ادا کیا وہ عادل شاہی اور قطب شاہی ہیں ۔ان دونوں ریاستوں کے دور حکومت میں مثنوی کی صنف نے خوب ترقی کی اور اردو ادب کو خوب فروغ حاصل ہوا۔

عادل شاہی دور (بیجاپور) میں مثنوی کا ارتقا

عادل شاہی ریاست کا قیام ۱۴۹۰ء میں عمل میں آیا جس کا بانی سلطان یوسف عادل شاہ تھا۔ اس نے بیجاپور کے علاقے میں اپنی حکومت قائم کی اور یہ حکومت دوسو سال تک چلتی رہی اس عرصے میں حکومت نے اردو ادب کو فروغ دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔مثنوی کے صنف اس دور میں خوب عام ہوئی اور درجنوں شعرا نے عمدہ قسم کی مثنویاں تخلیق کیں ۔جن میں عبدل، برہان الدین جانم ، مقیمی ،حسن شوقی ،علی عادل شاہ ثانی شاہی، نصرتی، ہاشمی، رستمی، اور ملک خوشنود قابل ذکر ہیں۔

برہان الدین جانم میراں جی شمس العشاق کے بیٹے ہیں انھوں نے کئی مثنویاں تخلیق کیں جو عنوان یہ ہیں ۔ ارشاد نامہ، حجت البقا، وصیت الہادی، بشارت الذکر، نسیم الکلام، منفعت الایمان، اور پنج گنج۔ان کی تمام مثنویوں کے موضوعات ت شریعت وتصوف اور اخلاق سے متعلق ہیں ۔عبدل ابراھیم عادل شاہ دور کے شاعر ہیں ۔انھوں نے ابراھیم شاہ کی فرمائش پر 'ابراھیم نامہ' کے عنوان سے مثنوی لکھی۔ جو ابراھیم عادل شاہ کا طویل قصیدہ ہے۔ میرزا محمد مقیمی بھی بیجاپور کے اہم شاعر ہیں ۔انھوں نے 'چندر بدن ومہیار' کے نام سے ایک مثنوی تحریر کی ہے اور اس مثنوی کو دکنی ادب میں بہت اہمیت حاصل ہے۔انھوں نے ایک رزمیہ مثنوی 'فتح نامہ بکھری' کے نام سے بھی تخلیق کی ہے۔اس میں راجا ایر بھدرا اور سلطان محمد شاہ کے درمیان ہونے والی جنگ کا ذکر ہے۔اسے اردو کی پہلی رزمیہ مثنوی قرار دیا گیا ہے۔امین ابراھیم عادل شاہ کے دور شاعر تھے۔انھوں نے 'بہرام وگل اندام' کے نام سے ایک مثنوی پیش کی ہے جسے انھوں نے ادھورا چھوڑ دیا تھا اس کی تکمیل مرزا دولت شاہ نے کی ۔شیخ حسن شوقی دکن کے مختلف درباروں سے وابستہ رہے ہیں لیکن ان کا زیادہ وقت بیجاپور میں گزرا ہے اس لئے ان کو اسی زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔انھوں نے 'فتح نامہ نظام شاہ'، اور 'میزبانی نامہ' کے عنوان سے دو مثنویاں تحریر کی ہیں ۔سید حسن شاہ محی الدین صنعتی نے 'قصہ بے نظیر' اور گلدستۂ عشق کے نام سے دو مثنویاں تحریر کی ہیں۔ان میں سے پہلی مثنوی مذہبی عنوان پر مبنی ہے جبکہ دوسری مثنوی عشقیہ ہے۔علی عادل شاہ ثانی صرف سلطان ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھا۔اس کے کلام میں تین مثنویاں ملتی ہیں ۔پہلی مثنوی حضرت علی کے فتح خیبر کے واقعہ پر مبنی ہے۔ جو خیبر نامے کے عنوان سے تحریر کی گئی ہے ۔علاوہ ازیں ان کی دو مثنویوں میں صرف سات سات اشعار پائے جاتے ہیں جو سنسکرت شعریات سے ماخود ہیں ۔ایک کا نام 'دکھائی گگن' جبکہ دوسری کی نام 'ایک محبوبہ' ہے۔عادل شاہی دور میں نصرتی کا نام بہت معتبر گردانا جاتا ہے ۔اس کی مثنوی 'گلشن عشق' اردو کا ایک شاہکار تسلیم کی جاتی ہے۔جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے ۔نصرتی کی دوسری مثنوی 'علی نامہ' ہے اردو کی

رزمیہ مثنوی میں علی نامہ سرفہرست ہے۔اس کے علاوہ 'تاریخ اسکندری' کے نام سے اس نے سکندر عادل شاہ کی فوج مہمات کے احوال بیان کئے ہیں۔ہاشمی کی مثنوی 'یوسف وزلیخا بھی عادل شاہی دور کی یادگار ہے۔ہاشمی ریختی کا صاحب دیون شاعر ہے۔یہ نابینا تھا۔اس کی مذکورہ مثنوی پانچ ہزار سے زائد اشعار پر مبنی ہے۔محققین نے یوسف زلیخا کے موضوع پر لکھی جانے والی مثنویوں میں ہاشمی کی مثنوی کو بہت سراہا ہے۔کمال خاں رستمی نے اسی دور میں اپنی معروف ترین مثنوی 'خاور نامہ' تحریر کی۔یہ فارسی کے خاور نامے سے ماخوذ ہے۔یہ چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ایک طویل رزمیہ مثنوی ہے جس میں حضرت علی کی مہمات کا تذکرہ کیا گیا ہے اگر چہ تاریخی لحاظ سے یہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔مگر فنی طور پر یہ دکن کی بہترین مثنوی قرار دی گئی ہے۔ملک خوشنود گولکندہ کا باشندہ تھا لیکن عبداللہ قطب شاہ کی بیٹی خدیجہ کے جہیز میں غلام کے طور پر بیجاپور آیا تھا۔یہ بہت ہی باکمال شاعر تھا۔اس نے 'یوسف وزلیخا' اور 'جنت سنگار' کے نام سے دو عظیم الشان مثنویاں تحریر کیں۔اسی دور میں امین نامی شاعر نے 'بہرام و حسن بانو' کے عنوان سے ایک مثنوی تحریر کی۔مختار عادل شاہی دور کا شاعر ہے۔اس نے ایک طویل 'معراج نامہ' مثنوی کے ہیئت میں تحریر کیا ہے۔اس کی دوسری مثنوی 'نور نامہ' بھی مذہبی نوعیت کی ہے۔اسی طرح ایاغی کی مثنوی 'نجات نامہ' میں شرعی فرائض وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔ان کے علاوہ شغلی ،شیوا،مومن،مرتضٰی،قدرتی،قادر،شاہ معظم وغیرہ بھی اہم مثنوی نگار شمار کئے جاتے ہیں۔انھیں مثنوی نگاروں کے ساتھ بیجاپور کی عادل شاہی دور کا اختتام ہو جاتا ہے۔

قطب شاہی دور (گولکنڈہ) میں مثنوی کا ارتقا

عادل شاہی حکومت کی طرح قطب شاہی سلطنت میں بھی اردو ادب کی خصوصی سرپرستی کی گئی۔اس حکومت کا بانی سلطان قطب شاہ تھا۔جس کے بعد سات اور بادشاہ گزرے ہیں ان میں محمد قلی شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے دور میں شعر و شاعری کے فن پر خصوصی توجہ دی گئی۔سلطان قطب شاہ بذات خود شاعر تھا۔وہ اردو و فارسی میں شعر کہا کرتا تھا۔اسی نے سلطان قلی قطب شاہ کے دیوان کو اپنے منظوم دیباچے کے ساتھ مرتب کیا۔اس کے دور میں وجہی،غواصی،قطبی،ابن نشاطی،جیسے معروف مثنوی نگار ہوئے ہیں۔

سلطان عبداللہ شاہ کے عہد میں طبعی،امین،اولیا اور غلام علی نے شعر و سخن میں نام حاصل کیا۔قطب شاہی دور پر نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا کہ اس دور میں مثنوی نگاری کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔قطب شاہ کے دور میں بطور مثنوی نگار سب سے پہلا نام شیخ احمد شریف گجراتی کا لیا جاتا ہے۔شریف گجراتی نے معروف داستان یوسف وزلیخا کو مثنوی کی شکل میں پیش کیا۔یہ مثنوی مولانا جامی کی فارسی مثنوی یوسف وزلیخا کا دکنی میں ترجمہ ہے۔ انھوں نے قلی قطب شاہ کی فرمائش پر مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' تخلیق کی جس میں لیلیٰ مجنوں کے قصے کو بیان کیا گیا ہے۔ اس دور کے دوسرے بڑے مثنوی نگار اسداللہ وجہی ہیں۔جنھوں نے محمد قلی قطب شاہ اور بھان متی کی محبت کی ایک

افسانوی داستان منظوم کی ہے۔ جو کا عنوان 'قطب مشتری' ہے۔اس مثنوی میں منظر نگاری اور سراپا نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں اور اس دور کی معاشرت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔شیخ بہاء الدین غواصی بھی قطب شاہی عہد کے ممتاز ترین شعرا میں سے تھے۔انھوں نے 'مینا ستونتی'، 'سیف الملوک و بدیع الجمال' اور طوطی نامہ کے نام سے تین مثنویاں تخلیق کیں۔ان میں سے غواصی کی اہم ترین مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال ہے جو الف لیلہ کے نثری قصے سے ماخوذ ہے۔اسی دور میں ابن نشاطی نے مثنوی پھول بن لکھی۔ جو اردو کی نمائندہ مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ مثنوی فارسی کی مثنوی 'بساطین الانس' سے ماخوذ ہے جو احمد حسین دبیر کی تخلیق کردہ ہے۔قطب شاہی دور میں قاضی محمود بحری نامی شاعر بھی ہوئے ہیں انھوں نے 'من لگن' اور بنگاب نامہ کے نام سے دو مثنویاں تحریر کی ہیں۔من لگن میں انھوں نے تصوف کے مضامین پیش کئے ہیں جبکہ بنگاب نامہ میں انھوں نے بھنگ (بھانک) کی تعریف کی ہے۔احمد جنیدی بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔انھوں نے 'ماہ پیکر' کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں قطب شاہی دور کی تہذیب و معاشرت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔اس میں واقعات نگاری، منظر نگاری اور سراپا کو پیش کرنے میں بہت محنت صرف کی گئی جس سے یہ مثنوی ادب میں ایک خاص مقام کی حامل ہو جاتی ہے۔طبعی اس دور کے آخری مشہور شاعر ہیں۔انھوں نے 'بہرام وگل اندام' کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے۔ جو فارسی نظامی کی فارسی مثنوی 'ہفت پیکر' سے ماخوذ ہے۔اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی اس کی زبان ہے جو ریختہ کی زبان سے قریب تر ہے جسے آج بھی آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ان کے علاوہ اس دور میں عاجز، وجدی، شغلی، شاہ راجو حسین، سیوک، لطیف، ضعیفی، خواص، قدرتی وغیرہ اہم مثنوی نگار گزرے ہیں۔ جنھوں نے اپنی تخلیقات سے مثنوی کے فن کو جلا بخشی۔گولکنڈہ کے زوال کے بعد وہاں کی محفل شعر و سخن پر زوال آ گیا۔جس سے متاثر ہو کر اکثر شاعر وہاں سے اورنگ آباد، برہان پور اور دہلی کی جانب کوچ کر جاتے ہیں۔اس طرح سے اردو مثنوی کے ایک عظیم الشان دور کا اختتام ہوتا ہے۔

2.3.2 شمال میں اردو مثنوی کا ارتقا

شمال میں اردو مثنوی کا باقاعدہ آغاز میر تقی میرؔ کے ذریعہ ہوتا ہے جبکہ اس سے پہلے ہمیں مثنویوں کے کچھ نمونے ضرور ملتے ہیں۔ان میں افضل کی بکٹ کہانی کو اولیت حاصل اور انھیں شمالی ہند کا پہلا مثنوی نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ان کی مثنوی بکٹ کہانی بارہ ماسہ کی صورت میں ہے۔میر جعفر زٹلی نے باقاعدہ مثنوی نہیں لکھی لیکن ان کی بعض نظمیں مثنویوں سے مماثلت رکھتی ہیں۔جن میں 'جوبن نامہ'، اور 'اختلاف زمان' کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ولی کے دیوان کی دہلی آمد کے بعد اس دیار میں اردو شاعری کو جب فروغ حاصل ہوا تو صنف غزل کے ساتھ ساتھ مثنوی کے فن میں طبع آزمائی کی جانے لگی۔شاہ مبارک آبرو، حاتم، فائز شاہ آیت اللہ جوہری اور میر تقی میر نے اسے فروغ دیا۔حاتم کے دیوان زادہ میں کل پانچ مثنویاں ہیں جن کے عناوین یہ ہیں۔(۱) مثنوی سراپا (۲) ساقی

نامہ(۳)وصف قہوہ(۴)وصف تمباکو(۵)مثنوی بہاریہ مسمّٰی بہ بزم عشرت از دیوان قدیم۔اس دور میں فائز نے سولہ مثنویاں لکھی۔جن کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱)مناجات(۲)در مدح شاہ ولایت(۳)تعریف پنگھٹ(۴)تعریف ہولی(۵)در وصف بھنگیرن درگاہ قطب(۶)رقعہ(۷)در وصف حسن(۸)رقعہ(۹)رقعۂ محبوب (۱۰)تعریف جوگن(۱۱)بیان میلہ مہتہ(۱۲)در وصف کاچھن(۱۳)تعریف بتولن(۱۴)تعریف نہان نکبود(۱۵)ماکن(۱۶)گوجری۔

شاہ آیت اللہ جوہری نے 'گوہر جوہری' کے نام سے ایک طویل مثنوی تحریر کی۔اس میں ۲۳۰۴/اشعار ہیں۔اسی دور میں فضائل علی خاں اور محمد فقیہ دردمند بھی مثنویاں لکھیں لیکن ان سب میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔یہ شمالی ہند میں مثنوی نگاری کا ابتدائی زمانہ ہے اور مذکورہ بالا تمام مثنویوں کی حیثیت صرف ابتدائی نقوش کی ہی ہے ان میں سے کوئی بھی مثنوی فن کے لحاظ سے شاہکار کہلانے کے لائق نہیں ہے۔

شمالی ہند میں مثنوی کا باقاعدہ آغاز میر وسودا کے دور سے ہوتا ہے۔میرزا محمد رفیع سودا نے کثیر تعداد میں مثنویاں کہی ہیں جو چوبیس کے ہند سے تک پہنچتی ہیں۔لیکن ان کی مثنویاں بھی ماقبل کے مثنوی نگاروں ہی کی طرح صرف روایت کا تسلسل ہیں ان میں کوئی خاص بات موجود نہیں ہے۔

شمالی ہند میں مثنوی کا باقاعدہ آغاز میر تقی میر کے ذریعے ہوتا ہے۔میر نہ صرف غزل گوئی کے امام ہیں بلکہ شمالی ہند میں مثنوی کے فن کے بھی وہی بنیاد گزار ہیں۔انھوں نے اپنی مثنویوں میں اپنی جولانیٔ فکر کا بھر پور مظاہرہ کیا ہے۔میر نے مثنوی کو خیالی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا سے آشنا کیا اور فنی سطح پر انھوں نے بے جا طوالت اس کو آزاد کیا۔اظہار و بیان ہیئت و اسلوب کی سطح پر انھوں نے اس صنف میں وہ کارنامہ انجام دیا جس سے وہ مابعد کے شعرا کے لئے مشعل راہ بن گئے ہیں۔ان صناعی و مہارت اور استادانہ صلاحیت کا ایک زمانہ معترف ہے۔ان کے متعلق ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''میر شمالی ہند کے چار بہترین مثنوی نگاروں میں سے ہیں۔باقی تین میر حسن،نسیم اور مرزا شوق ہیں۔میر نے ایک مخصوص انداز کی مثنویاں لکھیں جو اپنے زمانے میں اتنی مقبول ہوئیں کہ متعدد شعرا نے ان کا تتبع کیا۔''

(اردو مثنوی شمالی ہند میں(جلد اول)ڈاکٹر گیان چند جین،انجمن ترقی اردو ہند،دہلی،۱۹۸۷ء،ص۲۶۶)

میر نے ۳۹ مثنویاں لکھی ہیں جن کو چار زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔۱۔عشقیہ۲۔واقعاتی ۳۔مدحیہ ۴۔ہجویہ۔ان چاروں اقسام میں سے جس قسم کو سب سے زیادہ فوقیت حاصل ہے وہ ان کی عشقیہ مثنویاں ہیں۔ان کی تعداد ۹/ہے جن کے عناوین یہ ہیں:۱۔خواب و خیال۲۔معاملات عشق۳۔دریائے عشق۴۔شعلۂ عشق ۵۔ جوشِ عشق۶۔اعجاز عشق ۷۔حکایت عشق ۸۔جوان و عروس ۹۔مور نامہ۔

میر کی عشقیہ مثنویوں میں دریائے عشق ان کی شاہکار مثنوی تصور کی جاتی ہے۔اس مثنوی میں انھوں نے ایک نوجوان کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک لڑکی پر ہوتا ہے۔لڑکی کا باپ رسوائی سے بچنے کے لئے لڑکی کو دریا پار بھیجنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ عاشق بھی اس کشتی میں سوار ہو جاتا ہے۔راستہ میں لڑکی کی دایہ لڑکی کی ایک جوتی پانی میں پھینکتی ہے اور لڑکے سے کہتی ہے اگر تو اس کا سچا عاشق ہے تو اس کی جوتی واپس لے آ۔لڑکا بلا تاخیر پانی میں کود جاتا ہے اور پانی میں ڈوب کر مر جاتا ہے۔کچھ دن کے لڑکی پھر اپنے گھر کی طرف لوٹتی ہے تو وہ دایہ سے اس جگہ کے بارے میں پوچھتی ہے جہاں اس نے جوتی پھینکی تھی۔دایہ لڑکی کو مقام سے آگاہ کرتی تو لڑکی بھی اچانک اس جگہ کود کر پانی میں ڈوب جاتی ہے اس طرح دونوں عاشق معشوق دریا میں ڈوب کر آپس میں مل جاتے ہیں۔

ان کی دوسری مشہور مثنوی شعلۂ عشق ہے۔اس میں ایک وفادار بیوی کی داستان محبت رقم کی گئی ہے۔ میر مثنویات کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔جس میں ان کی ذاتی زندگی سے لیکر معاشرے اور ماحول وغیرہ کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔جس سے ان مثنویوں کا مطالعہ ان کی زندگی اور ان کے زمانے کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔اگر چہ فنی لحاظ سے میر کی عشقیہ مثنویاں ہی زیادہ مقبول ہوئیں۔اسی بنا پر آنے والے زمانے میں میر کا تتبع مثنوی کے باب میں خوب کیا گیا۔

میر کے بعد دہلی میں مثنوی کے تعلق سے جس شاعر کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ میر اثر ہیں۔اس فن میں اگر کوئی ان کے مقابل ہے تو وہ صرف میر حسن ہیں۔میر اثر نے اپنی مثنوی خواب وخیال میں کوئی واقعہ بیان نہیں کیا ہے بلکہ اس میں انھوں نے ہجر و وصال، راز و نیاز، عشق و محبت کی کیفیات کو نئی صورت میں پیش کیا ہے۔اس مثنوی کی سب بڑی خصوصیت اس کی زبان ہے جس کی ہر تنقید نگار نے تعریف کی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کے طرزِ بیان پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مثنوی 'خواب وخیال' اپنے طرزِ ادا کی وجہ سے اردو مثنویوں میں امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔اس میں عام بول چال کی زبان استعمال ہوئی ہے جس کی تخلیقی قوت کو سب سے پہلے میر نے پہچانا تھا۔میر اثر نے بھی اسی عام زبان کی تخلیقی توانائی سے کام لے کر اپنی مثنوی کو ایک نیا رنگ دیا ہے۔اس میں وہی سادگی وہی لہجہ، وہی الفاظ ملتے ہیں جو روز مرّہ کی بات چیت میں ہوتے ہیں۔یہاں یہی زبان ادبی زبان بن کر استعمال ہوئی ہے۔اظہار کی سطح پر ایک دریا ہے جو امنڈا چلا آرہا ہے۔جذبے کی سچائی، اظہار کی بے باکی، عام بول چال کی زبان اور روز مرّہ محاورہ نے اس میں ایک اچھوتا رنگ بھر دیا ہے جو اس مثنوی کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی وجہ سے اس کے بہت سے اشعار ضرب المثل بن کر ہمارے اظہار کا حصہ بن گئے ہیں۔''

(تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ص ۸۰۸، ۸۰۹)

میر اثر کے بعد شمالی ہند میں غلام میر حسن کا نام سب سے اہم مثنوی نگار کے طور پر لیا جاتا ہے۔میر حسن

دہلی کے رہنے والے تھے پھر انھوں نے یہاں سے اپنے والد کے ساتھ ہجرت کی اور آخر کار لکھنؤ میں قیام کیا۔ میر حسن نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی مگر ان کو شہرت مثنوی نگاری ہی میں حاصل ہوئی۔ انھوں نے چھوٹی بڑی بارہ مثنویاں لکھی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔نقل کلاونت ۲۔نقل زن فاحشہ ۳۔ہجو قصائی ۴۔نقل قصائی ۵۔مثنوی شادی آصف الدولہ ۶۔مثنوی رموز العارفین ۷۔مثنوی ہجو حویلی ۸۔مثنوی گلزارِ ارم ۹۔مثنوی در تہنیت عید ۱۰۔مثنوی در وصف کشف جوہر ۱۱۔مثنوی درخوان نعمت ۱۲۔مثنوی سحر البیان۔

مذکورہ بالا مثنویوں میں سے صرف مثنوی سحر البیان ہی ان کی شاہکار تسلیم کی جاتی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مثنوی سحر البیان میں مثنوی کے فن کا ایسا شاہکار ہے جس کے مثل نہ اس سے قبل کوئی مثنوی نظر آتی ہے نہ اس کے بعد اور اردو کے تمام نقادوں نے اس مثنوی کو اس کی جامعیت کی وجہ سے بہت سراہا ہے۔ چنانچہ مثنوی سحر البیان کے تعلق سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا تجزیہ بہت ہی مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں انھوں نے اس مثنوی کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مثنوی سحر البیان ۲۱۷۹ اشعار پر مشتمل میر حسن کا ایک ایسا شاہکار ہے جس میں وہ ساری خصوصیات یکجا ہو گئیں ہیں جو ایک بہترین مثنوی میں تصور کی جاسکتی ہیں۔ اس میں ایک طرف مثنوی کی روایتی ہیئت کو پورے طور پر برتا گیا ہے اور دوسری طرف اس میں قصہ پن کے ساتھ وہ ترتیب و ربط، شاعرانہ صفات، توازن و اختصار، تہذیب و معاشرت کی اثر انگیز تصویریں، منظرکشی و کردار نگاری، سلاست و روانی، زبان و بیان کا فن کارانہ استعمال بھی ہے کہ دوسو سال گزر جانے کے باوصف یہ آج بھی اسی طرح دلچسپ، پر اثر اور تازہ ہے۔ اس مثنوی کی اہمیت کسی ایک وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس میں ساری خصوصیات یکجا ہو کر ایک ایسے توازن کے ساتھ ایک جان ہو گئی ہیں کہ فن پارے کا مجموعی فنی اثر دائمی ہو گیا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ص ۸۵۰، ۸۵۱)

مذکورہ اقتباس میں اس مثنوی کی تمام خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اس مثنوی کی کامیابی کے پیچھے کوئی ایک سبب نہیں بلکہ یہ مثنوی پورے طور پر فنی معیار پر کامل اترتی ہے۔ جو شاعر کی فنی پختگی پر دال ہے۔

دہلی کے اجڑنے کے بعد جب لکھنؤ میں شعر و ادب کی محفل جمی تو یہاں بہت سے شعرا نے میر تقی میر اور میر اثر کے تتبع میں مثنویاں تخلیق کی لیکن ان میں سے معدودے چند کے علاوہ ساری مثنویاں صرف روایت کی پاسداری تک محدود رہیں۔ ان میں کوئی تازگی اور نیا پن نہیں ملتا جو ان مثنویوں کو شاہکار کا درجہ عطا کر دے۔ میر حسن کے علاوہ دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق ہی شمالی ہند میں قابل قدر مثنوی نگار تصور کئے جاتے ہیں جن کی مثنویاں

ایوان شعروادب میں تحسین آمیز نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔میر حسن کے معاصرین میں راسخ عظیم آبادی نے کئی مثنویاں لکھی ہیں جن میں میر تقی میر کے تتبع کے علاوہ کوئی نئی بات سامنے نہیں آتی۔اس دور میں میر جعفر نے 'طوطی نامہ' کے نام سے ایک طویل مثنوی کہی جو ایک روایتی عشقیہ مثنوی ہے۔اسی زمرے میں نظیر اکبر آبادی، مرزا علی لطف، شیر علی افسوس، تجلی اور عبرت بھی شامل ہیں۔ مصحفی جو غزل کے مشہور استاد شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں انھوں نے بہت سی مثنویاں کہی ہیں جن کی تعداد بیس تک پہنچتی۔ان مثنویوں میں سے صرف ان کی ایک مثنوی 'بحر المحبت' ہی زیادہ مشہور ہے۔اس میں میر تقی میر کی مثنوی دریائے عشق ہی کے قصے کو نظم کیا گیا ہے۔جرأت نے بھی ۳۱ر مثنویاں کہی ہیں جن میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔اسی دور میں انشاء اللہ خاں انشاء نے ۱۱ر مختصر مثنویاں لکھی ہیں۔اس دور میں سب سے زیادہ مثنوی سعادت یار خاں رنگیں نے لکھی ہیں جن کی تعداد ۴۳ر تک پہنچتی ہے۔

مومن اور دیا شنکر نسیم کے دور میں مثنوی کے فن کو کچھ فروغ حاصل ہوا۔مومن کی غزل گوئی اردو میں معروف ہے اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے بارہ مثنویاں بھی کہی ہیں جن میں سے سات عشقیہ مثنویاں ہیں۔ان مثنویوں میں سے 'قول غمیں' سب سے مشہور مثنوی ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ انھوں نے 'گلزار نسیم' کے نام سے اردو کی شاہکار مثنوی تحریر کی جو لکھنؤ کی نمائندہ مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔مثنوی گلزار نسیم ادبی و فنی خصوصیات کا بہترین مرقع ہے۔اس میں صناعی، حسن کاری، سلیس گفتگو، چست بندش، شکوہ الفاظ، نادر تشبیہات، روزمرہ اور محاورات اور واقعہ کو ایسی فنی چابکدستی کے ساتھ بیان کیا گیا جو اپنی مثال آپ ہے۔ادبی درجہ بندی کے لحاظ سے اسے اردو کی دوسری سب سے اہم مثنوی قرار دیا گیا ہے۔آتش کے ایک دوسر شاگرد نواب مرزا شوق نے بھی زبان و بیان کے لحاظ سے بہت ہی عمدہ مثنویاں کہی ہیں۔ان کی تینوں مثنویاں اسلوب کے اعتبار سے معروف ہیں جن کے نام یہ ہیں: بہار عشق، فریب عشق اور زہر عشق۔ان میں سب سے زیادہ مشہور زہر عشق ہے۔اس کا قصہ آپ بیتی کے طور پر لکھا گیا ہے۔جس میں ایک نوجوان ایک عالی خاندان کی لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے اور وہ لڑکی بھی اسے پسند کرتی مگر وصال کے اسباب پیدا نہیں ہو پاتے آخر اسی غم میں لڑکی خودکشی کر لیتی ہے۔یہ مثنوی فن، پلاٹ اور کردار ہر لحاظ سے کمزور ہے مگر اس میں زبان و بیان کی سلاست، جذبات کی شدت اور اسلوب کی شگفتگی نے اس کے تمام عیب کو چھپا دیا ہے۔شوق کی اس مثنوی نے انھیں ادبی دنیا میں زندہ و جاوید رکھا ہے۔علاوہ ازیں شمالی ہند میں مثنوی نگاروں کی ایک بڑی تعداد ملتی جس میں سے کچھ معروف لوگوں کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ان میں واجد علی شاہ اختر، امیر اللہ تسلیم، امیر مینائی، داغ دہلوی، احمد علی شوق قدوائی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔انھوں مثنوی کے روایتی انداز کی رعایت کے ساتھ جدید اثرات کو بھی اس میں جگہ دینے کی کوشش کی۔ پھر دور جدید میں مولانا محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے زیر اثر جدید مثنویوں کی بنیاد ڈالی اور مثنوی کو مافوق الفطرت عناصر سے پاک کیا اب مثنویوں میں سیاسی، سماجی، حب الوطنی اور جدید

مسائل کی ترجمانی کی جانے لگی ۔مولانا الطاف حسین حالی نے 'برکھا رت' اور 'چپ کی داد' جیسی مثنویاں لکھیں ۔ علامہ شبلی نعمانی نے مثنوی صبح امید تحریر کی ۔ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی مثنوی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ان کی مثنویوں میں 'سید کی لوح تربت'، 'انسان اور بزم قدرت' اور 'رخصت اے بزم جہاں' قابل ذکر ہیں ۔جوش ملیح آبادی نے بھی عمدہ کہی ہیں ۔جن میں 'جنگل کی شہزادی'، 'جمنا کے کنارے' اور 'سہاگن بیوہ' معروف ہیں ۔حفیظ جالندھری کی شاہنامہ اسلام جدید دور کی طویل ترین اور کامیاب ترین مثنویوں میں سے ایک ہے ۔ترقی پسند شاعروں نے بھی جدید دور کے مسائل پر اچھی مثنویاں تخلیق کی ہیں ۔علی سردار جعفری کی 'جمہور'، کیفی کی 'خانہ جنگی' اور جاں نثار اختر کی 'امن نامہ' وغیرہ اہم ہیں ۔اس طور پر دکن سے لے کر دہلی تک اور پھر لکھنؤ اور جدید دور تک ہم نے اردو مثنوی کا ایک اجمالی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے ۔جس سے مثنوی نگاری کی روایت کا پورا خاکہ اور اس میں عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیاں اور اردو کی شاہکار مثنویوں سے ہم واقف ہو چکے ہیں ۔آج بھی مثنوی کا فن زندہ و تابندہ ہے اور اس دور کے شعرا آج بھی اس صنف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو قابل تحسین ہے ۔

2.3.3 حاصل مطالعہ

دکن میں اردو مثنوی کے جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دکن میں مثنوی نگاری کی ایک عظیم الشان روایت پائی جاتی ہے ۔اس کا باقاعدہ آغاز بہمنی دور میں ہوا ۔فخر دیں نظامی کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کو اردو کی پہلی مثنوی قرار دیا گیا ہے ۔اس دور کی دیگر مثنویوں میں میراں جی شمس العشاق کی خوش نامہ'، 'خوش نغز'، اور 'شہادت الحقیقت' ہیں ۔اشرف بیابانی کی 'واحد الباری'، لازم المبتدی' اور 'نوسرہار' معروف ہیں ۔بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد عادل شاہی حکومت میں بھی بڑی تعداد میں مثنویاں لکھی گئی جن میں عبدل کی 'ابراھیم نامہ' برہان الدین جانم کی 'ارشاد نامہ'، وصیت الہادی'، 'منفعت الایمان'، مقیمی کی 'چندر بدن و مہیار'، 'فتح نامہ نظام شاہ'، میز بانی نامہ'، نصرتی کی 'گلشن عشق'، 'علی نامہ'، 'تاریخ اسکندری'، میراں ہاشمی کی 'یوسف زلیخا'، 'معراج نامہ'، ملک خوشنود کی 'جنت سنگار' اور رستمی کی 'خاور نامہ' وغیرہ اس دور کی اہم ترین مثنویاں گردانی جاتی ہیں ۔گولکنڈہ کی قطب شاہی عہد سلطنت میں کثرت سے مثنویاں تخلیق کی گئی ہیں ۔جن احمد گجراتی کی 'یوسف زلیخا'، 'لیلیٰ مجنوں'، ملا وجہی کی 'قطب مشتری' ابن نشاطی کی 'پھول بن'، غواصی کی 'مینا ستونتی'، 'سیف الملوک و بدیع الجمال'، 'طوطی نامہ'، جنیدی کی 'ماہ پیکر' اور طبعی کی 'بہرام و گل اندام' کا شمار اردو کی مشہور مثنویوں میں ہوتا ہے ۔بعد کے ادوار میں غزلت کی 'روضۃ الشہدا' ابجری کی 'من لگن'، حسین ذوقی 'وصال العاشقین' مجری کی 'گلشنِ حسن دل' ولی کی 'در مدحت سورت' اور سراج کی 'بوستان خیال' وغیرہ دکن کی عظیم الشان مثنوی کی روایت کو آگے بڑھاتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔دکن کی مثنوی نگاری کی یہ مستحکم روایت شمالی ہند کے شعرا کے لئے ایک مثالی نمونہ تھی لیکن بدقسمتی سے شمالی ہند میں ابتدائی دور میں اچھی مثنویاں تحریر نہیں کی گئیں ۔ہمیں اس دور میں جو ابتدائی مثالیں ملتی ہیں ان میں افضل کی 'بکٹ کہانی'، جعفر زٹلی

کی 'جوبن نامہ'، اور 'اختلاف زمان' شامل ہیں۔ ولی کے دیوان کی دہلی آمد کے بعد جب شمال میں ریختہ کی شاعری کو فروغ حاصل ہوا تو غزل کے ساتھ ساتھ مثنویاں بھی تخلیق کی گئیں۔ اس دور میں شاہ مبارک آبرو نے 'آرائش معشوق'، حاتم کی 'مثنوی سراپا'، 'ساقی نامہ'، 'وصف قہوہ'، 'وصف تمباکو'، 'مثنوی بہاریہ مسمّٰی بہ بزم عشرت' اور فائز نے سولہ مثنویاں لکھی ہیں۔ شمال میں مثنوی کا باقاعدہ آغاز میر تقی میر سے ہوتا ہے میر نے بڑی تعداد میں مثنویاں لکھی جن میں ''دریائے عشق' اور 'شعلۂ عشق' معروف ہیں۔ اس دور میں میر اثر کی مثنوی 'خواب خیال' کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ میر تقی میر اور میر اثر کے تتبع میں بہت سے شعرا نے طبع آزمائی کی جن میں راسخ عظیم آبادی، قائم چاند پوری، میر سوز، مصحفی، ہدایت اللہ خاں ہدایت، مرزا علی لطف، جرأت، میر حسن، انشاء اللہ خاں انشاء کے نام معروف ہیں۔ زوال کے بعد جب دوبارہ دہلی آباد ہوئی تو غالب، مومن وغیرہ نے غزل کے ساتھ مثنوی بھی لکھیں لیکن ان میں کوئی نیا پن نہیں ملتا۔ اس دور میں لکھنؤ کے دبستان میں مثنوی کے فن کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ لکھنؤ میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔ اسی طرح دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' نے بھی خوب داد وتحسین حاصل کی۔ ان دونوں مثنویوں کے بعد مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق کی خوب پذیرائی ہوئی۔ پہلے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد واجد علی شاہ، امیر مینائی، امیر اللہ تسلیم، داغ دہلوی اور شوق قدوائی نے روایتی مثنویوں کو فروغ دیا۔۔ پھر دور جدید میں مولانا محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے زیر اثر جدید مثنویوں کی بنیاد ڈالی اور مثنوی کو مافوق الفطرت عناصر سے پاک کیا اب مثنویوں میں سیاسی، سماجی، حب الوطنی اور جدید مسائل کی ترجمانی کی جانے لگی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے 'برکھارت' اور 'چپ کی داد' جیسی مثنویاں لکھیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے مثنوی صبح امید تحریر کی۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی مثنوی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کی مثنویوں میں 'سید کی لوح تربت'، 'انسان اور بزم قدرت' اور 'رخصت اے بزم جہاں' قابل ذکر ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے بھی عمدہ کہی ہیں۔ جن میں 'جنگل کی شہزادی'، 'جمنا کے کنارے' اور 'سہاگن بیوہ' معروف ہیں۔ حفیظ جالندھری کی شاہنامہ اسلام جدید دور کی طویل ترین اور کامیاب ترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے بھی جدید دور کے مسائل پر اچھی مثنویاں تخلیق کی ہیں۔ علی سردار جعفری کی 'جمہور'، کیفی کی 'خانہ جنگی' اور جاں نثار اختر کی 'امن نامہ' وغیرہ اہم ہیں۔ اس طور پر دکن سے لے کر دہلی تک اور پھر لکھنؤ اور جدید دور تک مثنوی نگاری کی ایک مضبوط روایت قائم ہوئی جو آج بھی جاری وساری ہے۔

2.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے مطالعے سے آپ نے

دکن میں مثنوی کے آغاز وارتقا کے بارے میں معلومات حاصل کی۔

شمالی ہند میں مثنوی کے آغاز وارتقا سے واقفیت حاصل کی۔

دکن اور شمال کی نمائندہ مثنویوں سے آگہی حاصل کی۔

دکن اور شمال کے نمائندہ مثنوی نگاروں سے آشنائی حاصل کی۔

2.5 اپنا امتحان خود کیجئے

1. دکن کی پہلی مثنوی کون سی ہے اس کے خالق کا نام بتائیں؟
2. شمالی ہند کی پہلی مثنوی کون سی ہے اس کے تخلیق کار کا نام بتائیں؟
3. میر کی مثنوی نگاری پر ایک مختصر نوٹ لکھیں؟
4. دکن میں مثنوی نگاری کی روایت پر مختصر نوٹ لکھیں؟
5. شمال میں مثنوی نگاری کی روایت پر مختصر مضمون لکھیں؟

2.6 سوالات کے جوابات

1. دکن کی پہلی مثنوی 'کدم واؤ پدم راؤ' ہے اور اس کے خالق فخر دین نظامی ہیں۔
2. شمالی ہند کی پہلی مثنوی 'بکٹ کہانی ہے اور اس کے خالق افضل پانی پتی ہیں۔
3. شمالی ہند میں مثنوی کا باقاعدہ آغاز میر تقی میر کے ذریعے ہوتا ہے۔ میر نہ صرف غزل گوئی کے امام ہیں بلکہ شمالی ہند میں مثنوی کے فن کے بھی وہی بنیاد گزار ہیں۔ انھوں نے اپنی مثنویوں میں اپنی جولانی فکر کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ میر نے مثنوی کو خیالی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا سے آشنا کیا اور فنی سطح پر انھوں نے بے جا طوالت اس کو آزاد کیا۔ اظہار و بیان ہیئت و اسلوب کی سطح پر انھوں نے اس صنف میں وہ کارنامہ انجام دیا جس سے وہ مابعد کے شعرا کے لئے مشعل راہ بن گئے ہیں۔ ان صناعی و مہارت اور استادانہ صلاحیت کا ایک زمانہ معترف ہے۔

میر نے ۳۹ مثنویاں لکھی ہیں جن کو چار زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ عشقیہ ۲۔ واقعاتی ۳۔ مدحیہ ۴۔ ہجویہ۔ ان چاروں اقسام میں جس قسم کو سب سے زیادہ فوقیت حاصل ہے وہ ان کی عشقیہ مثنویاں ہیں۔ ان کی تعداد ۹ ر ہے جن کے عناوین یہ ہیں: ۱۔ خواب و خیال ۲۔ معاملات عشق ۳۔ دریائے عشق ۴۔ شعلۂ عشق ۵۔ جوشِ عشق ۶۔ اعجاز عشق ۷۔ حکایت عشق ۸۔ جوان و عروس ۹۔ مورنامہ۔

میر کی عشقیہ مثنویوں میں دریائے عشق ان کی شاہکار مثنوی تصور کی جاتی ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے ایک نوجوان کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک لڑکی پر ہوتا ہے۔ لڑکی کا باپ رسوائی سے بچنے کے لئے لڑکی کو دریا پار بھیجنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ عاشق بھی اس کشتی میں سوار ہو جاتا ہے۔ راستہ میں لڑکی کی دایہ لڑکی کی ایک جوتی پانی میں پھینکتی ہے اور لڑکے سے کہتی ہے اگر تو اس کا سچا عاشق ہے تو اس کی جوتی واپس لے آ۔ لڑکا بلا تاخیر پانی میں کود جاتا ہے اور پانی میں ڈوب کر مر جاتا ہے۔ کچھ دن کے لڑکی پھر اپنے گھر کی طرف لوٹتی ہے تو وہ دایہ سے اس جگہ کے بارے میں پوچھتی ہے جہاں اس نے جوتی پھینکی تھی۔ دایہ لڑکی کو مقام سے آگاہ کرتی تو لڑکی بھی اچانک اس جگہ کود

کر پانی میں ڈوب جاتی ہے اس طرح دونوں عاشق معشوق دریا میں ڈوب کر آپس میں مل جاتے ہیں۔

ان کی دوسری مشہور مثنوی شعلۂ عشق ہے۔اس میں ایک وفادار بیوی کی داستان محبت رقم کی گئی ہے۔ میر مثنویات کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔جس میں ان ذاتی زندگی سے لیکر معاشرے اور ماحول وغیرہ کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔جن کا مطالعہ ان کی زندگی اور ان کے زمانے کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔اگر چہ فنی لحاظ سے میر کی عشقیہ مثنویاں ہی زیادہ مقبول ہوئیں۔اسی بنا پر آنے والے زمانے میں میر کا تتبع مثنوی کے باب میں خوب کیا گیا۔

4. دکن میں مثنوی نگاری کا با قاعدہ آغاز بہمنی دور میں ہوا۔فخر دیں نظامی کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کو اردو کی پہلی مثنوی قرار دیا گیا ہے۔اس دور کی دیگر مثنویوں میں میراں جی شمس العشاق کی خوش نامہ'، 'خوش نغز'، اور 'شہادت الحقیقت' ہیں۔اشرف بیابانی کی 'واحد الباری'، لازم المبتدی' اور 'نوسر ہار' معروف ہیں۔بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد عادل شاہی حکومت میں بھی بڑی تعداد میں مثنویاں لکھی گئی جن میں عبدل کی 'ابراھیم نامہ' برہان الدین جانم کی 'ارشاد نامہ'، وصیت الہادی'، 'منفعت الایمان'، مقیمی کی 'چندر بدن ومہیار'، 'فتح نامہ نظام شاہ'، میز بانی نامہ'، نصرتی کی 'گلشن عشق'، 'علی نامہ'، 'تاریخ اسکندری'، میراں ہاشمی کی 'یوسف زلیخا'، 'معراج نامہ'، ملک خوشنود کی 'جنت سنگار' اور رستمی کی 'خاور نامہ' وغیرہ اس دور کی اہم ترین مثنویاں گردانی جاتی ہیں۔گولکنڈہ کی قطب شاہی عہد سلطنت میں کثرت سے مثنویاں تخلیق کی گئی ہیں۔جن احمد گجراتی کی 'یوسف زلیخا'، 'لیلیٰ مجنوں'، ملا وجہی کی 'قطب مشتری' ابن نشاطی کی 'پھول بن'، غواصی کی 'مینا ستونتی'، 'سیف الملوک و بدیع الجمال'، 'طوطی نامہ'، جنیدی کی 'ماہ پیکر' اور طبعی کی 'بہرام وگل اندام' کا شمار اردو کی مشہور مثنویوں میں ہوتا ہے۔بعد کے ادوار میں غزلت کی 'روضۃ الشہدا' ابجری کی 'من لگن'، حسین ذوقی 'وصال العاشقین'، مجری کی 'گلشنِ حسن دل'، ولی کی 'در مدحت سورت' اور سراج کی 'بوستان خیال' وغیرہ دکن کی عظیم الشان مثنوی کی روایت کو آگے بڑھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

5. دکن کی مثنوی نگاری کی یہ مستحکم روایت شمالی ہند کے شعرا کے لئے ایک مثالی نمونہ تھی لیکن بد قسمتی سے شمالی ہند میں ابتدائی دور میں اچھی مثنویاں تحریر نہیں کی گئیں۔ہمیں اس دور میں جو ابتدائی مثالیں ملتی ہیں ان میں افضل کی 'بکٹ کہانی'، جعفر زٹلی کی 'جوبن نامہ'، اور 'اختلاف زمان' شامل ہیں۔ولی کے دیوان کی دہلی آمد کے بعد جب شمال میں ریختہ کی شاعری کو فروغ حاصل ہوا تو غزل کے ساتھ ساتھ مثنویاں بھی تخلیق کی گئیں۔اس دور میں شاہ مبارک آبرو نے 'آرائش معشوق'، حاتم کی 'مثنوی سراپا'، 'ساقی نامہ'، 'وصف قہوہ'، 'وصف تمباکو'، 'مثنوی بہاریہ مسمّٰی بہ بزم عشرت' اور فائز نے سولہ مثنویاں لکھی ہیں۔شمال میں مثنوی کا با قاعدہ آغاز میر تقی میر سے ہوتا ہے میر نے بڑی تعداد میں مثنویاں لکھی جن میں ''دریائے عشق' اور 'شعلۂ عشق' معروف ہیں۔اس دور میں میر اثر کی مثنوی 'خواب خیال' کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔میر تقی میر اور میر اثر کے تتبع میں بہت سے شعرا نے طبع آزمائی کی جن میں راسخ

عظیم آبادی، قائم چاند پوری، میر سوز، مصحفی، ہدایت اللہ خاں ہدایت، مرزا علی لطف، جرأت، میر حسن، انشاء اللہ خاں انشاء کے نام معروف ہیں۔ زوال کے بعد جب دوبارہ دہلی آباد ہوئی تو غالب، مومن وغیرہ نے غزل کے ساتھ مثنوی بھی لکھیں لیکن ان میں کوئی نیا پن نہیں ملتا۔ اس دور میں لکھنؤ کے دبستان میں مثنوی کے فن کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ لکھنؤ میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔ اسی طرح دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' نے بھی خوب داد و تحسین حاصل کی۔ ان دونوں مثنویوں کے بعد مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق کی خوب پذیرائی ہوئی ۔ پہلے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد واجد علی شاہ، امیر مینائی، امیر اللہ تسلیم، داغ دہلوی اور شوق قدوائی نے روایتی مثنویوں کو فروغ دیا۔۔ پھر دور جدید میں مولانا محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے زیر اثر جدید مثنویوں کی بنیاد ڈالی اور مثنوی کو مافوق الفطرت عناصر سے پاک کیا اب مثنویوں میں سیاسی، سماجی، حب الوطنی اور جدید مسائل کی ترجمانی کی جانے لگی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے 'برکھارت' اور 'چپ کی داد' جیسی مثنویاں لکھیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے مثنوی صبح امید تحریر کی۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی مثنوی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کی مثنویوں میں 'سید کی لوح تربت'، 'انسان اور بزم قدرت' اور 'رخصت اے بزم جہاں' قابل ذکر ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے بھی عمدہ کہی ہیں۔ جن میں 'جنگل کی شہزادی'، 'جمنا کے کنارے' اور 'سہاگن بیوہ' معروف ہیں۔ حفیظ جالندھری کی شاہنامہ اسلام جدید دور کی طویل ترین اور کامیاب ترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے بھی جدید دور کے مسائل پر اچھی مثنویاں تخلیق کی ہیں۔ علی سردار جعفری کی 'جمہور'، کیفی کی 'خانہ جنگی' اور جاں نثار اختر کی 'امن نامہ' وغیرہ اہم ہیں۔ اس طور پر دکن سے لے کر دہلی تک اور پھر لکھنؤ اور جدید دور تک مثنوی نگاری کی ایک مضبوط روایت قائم ہوئی جو آج بھی جاری و ساری ہے

2.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
مافی الضمیر	جو کچھ دل میں ہے، منشا، ارادہ
مسمیٰ	نام رکھنا، جو پکارا گیا، جس کا نام رکھا گیا
رزمیہ	جنگ کے واقعات، جنگ کے حالات
جِلا	چمکانا، صیقل کرنا، فروغ دینا
مماثلت	مثل، مانند، ملتا جلتا
نقوش	نشانات، آثار، بیل بوٹے
جولانیٔ فکر	فکر کی روانی، خیال کی بلندی
مظاہرہ	ظاہر کرنا، سامنے لانا

طوالت	لمبائی، درازی
صناعی	کاریگری، فن کاری
معترف	اعتراف کرنا، تسلیم کرنا، قائل ہونا
تخلیق	بنانا، پیدا کرنا، وجود میں لانا
ضرب المثل	کہاوت، وہ بات جو مثال کے طور پر بیان کی جائے
شاہکار	عظیم، بہترین کام، قابل قدر
مرقع	تصویر کا البم، خاکہ، البم
روزمرہ	بول چال، روز آنہ کی بات چیت، ہر روز، آئے دن
تشبیہ	ایک چیز کو دوسری کی مثل ٹھہرانا

2.8 کتب برائے مطالعہ

1. اردو مثنوی کا ارتقاء شمالی ہند میں	سید محمد عقیل رضوی
2. اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین
3. اردو مثنوی کا ارتقا	عبدالقادر سروری
4. مثنوی نگاری	علی جواد زیدی
5. جدید اردو مثنوی فن اور فکری ابعاد	ظفر انصاری ظفر

اکائی 3. ملا وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ

ساخت

3.1 اغراض و مقاصد

3.2 تمہید

3.3 ملا وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ

3.3.1 ملا وجہی: سوانحی کوائف

2.3.3 ملا وجہی کے ادبی کارنامے

3.3.3 قطب مشتری کا جائزہ

3.4.3 خلاصہ

3.4 آپ نے کیا سیکھا؟

3.5 اپنا امتحان خود لیجئے

3.6 سوالات کے جوابات

3.7 کلیدی الفاظ

3.8 کتب برائے مطالعہ

3.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

ملا وجہی کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کریں گے۔

ملا وجہی کے ادبی کارناموں سے متعارف ہوں گے۔

ملا وجہی کی مثنوی قطب و مشتری کا جائزہ لیں گے۔

3.2 تمہید

طلبائے گرامی! گزشتہ اکائی میں آپ مثنوی کی آغاز وارتقا سے واقف ہوئے ہیں۔اس میں آپ نے دکن میں مثنوی نگاری کی روایت اور پھر شمال میں مثنوی نگاری کی روایت سے آشنائی حاصل کی۔اس اکائی میں آپ دکن کے معروف مثنوی نگار ملا اسد اللہ وجہی کے سوانحی کوائف، ان کی ادبی خدمات اور آخر میں ان کی مثنوی 'قطب و

مشتری' سے آگہی حاصل کریں گے۔

3.3 ملا وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ

3.3.1 ملا وجہی: سوانحی کوائف

ملا وجہی کے حالات زندگی اور ان کے خاندانی پس منظر وغیرہ کے بارے میں کوئی پختہ معلومات نہیں ملتی اور قدیم تذکرہ نگاروں نے بھی ان کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے لیکن ملا وجہی کے حالات زندگی ان کی تصانیف میں جزوی طور پر ملتے ہیں۔ ان کڑیوں کو جوڑنے سے ان کی زندگی کا ایک قیاسی خاکہ تیار ہو جاتا ہے۔ ملا اسد اللہ وجہی کا خاندان خراسان سے ہجرت کر کے گولکنڈہ آیا۔ یہ خاندان علما فضلا پر مشتمل تھا چنانچہ اس خاندان کو ابتدا ہی سے سلطنت میں منصب ملتے رہے۔ اسی خامدان میں ملا جہی نے آنکھیں کھولیں۔ ملا وجہی کی سنہ پیدائش کے سلسلے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید وششت نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۵۵۱ء سے ۱۵۵۶ء کے درمیان قرار دی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ان کا سن ولادت ۱۵۵۵ء سے ۱۵۵۸ء کے درمیان بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کے مطابق ان کی سن پیدائش ۱۵۶۰ء سے ۱۵۶۴ء کے درمیان قرار پاتی ہے لیکن تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ ملا وجہی نے اپنے زندگی میں چار بادشاہوں کا زمانہ پایا ہے۔ ابرھیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ۔ ابراھیم قطب شاہ کا دور حکومت وجہی کا زمانۂ طفولیت کا ہے۔ جس سے یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ ان کی پیدائش ابراھیم قطب شاہ (۱۵۸۰ء۔۱۵۵۰ء) کے دور حکومت میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔ چونکہ ان کا خاندان حکومتی امور میں دخیل تھا اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت نہایت عمدہ ہوئی۔ وجہی کے ایک فارسی شعر سے ان کے شاعری کے استاد کے بارے میں بھی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ان کے استاد کا نام روح الامین تھا۔ یا پھر اسے حضرت جبرئیل کی طرف بھی اشارہ مانا جاسکتا ہے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد وجہی محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے اور ان کو درباری شاعروں شامل کرلیا گیا رفتہ رفتہ وہ ترقی کرتے ہوئے ملک الشعرا کے عہدے سے سرفراز ہوئے۔ اس زمانے میں ملا وجہی کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا جس پر انھوں نے اپنی مثنوی قطب مشتری میں خوب ناز کیا ہے:

نہ پہنچے نہ پہنچا ہے گن گیان میں — سو طوطی منج ایسا ہندوستان میں
کہ باتاں یوسن کر مری گیان کیاں — رہیاں ٹھک ہو قمریاں خراسان کیاں
جتے شاعراں شاعر ہو آئیں گے — سو منج تے طرز شعر کا پائیں گے

ان کی تعلّی اور اپنے معاصرین سے ان کی چشمک برابر جاری رہی لیکن وہ اس دور میں بادشاہ وقت کے مقرب تھے اس لئے اس زمانہ میں ملا وجہی کو ہر قسم کی آزادی حاصل رہی۔ اگر چہ دوسری طرف ان کے حاسدین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد نئے بادشاہ محمد قطب شاہ (۱۰۳۵ھ۔۱۰۲۰

ھ) کولوگوں نے ملا وجہی سے بدظن کر دیا جس کی وجہ سے ان سے وہ مقام ومرتبہ چھین لیا گیا۔اس پورے عرصے میں ملا وجہی مطلع سے غائب نظر آتے ہیں۔انھوں نے اس زمانۂ معزولیت کے درمیان اپنی تنگ دستی و پریشانی کو فارسی اشعار میں بیان کیا ہے۔اگر چہ ان کے مفلسی اور تنگ دستی کے دن عبداللہ قطب شاہ کے بادشاہ بنتے ہی دور ہو گئے۔اس بادشاہ نے ملا وجہی کو دوبارہ دربار میں منصب سے نوازا۔جس کا ذکر سب رس کے دیباچہ میں ملتا ہے:

صبا کے وقت بیٹھے تخت،غیب تے کچھ رمز پا کر
دل میں اپنے کچھ لیا کر وجہی نادر من کوں دریا دل
گوہر سخن کوں حضور بلائے پان دئے بہوت مان دئے

(سب رس،ملا وجہی،مرتبہ عبدالحق،انجمن ترقی اردو ہند،نئی دہلی،ص ۸)

ملا وجہی کے کے مسلک کے تعلق سے اکثر محققین کا یہ خیال ہے کہ وہ اہل تشیّع میں سے تھے۔جب کہ بعض تحقیق نگاروں نے ان کے اہل تسنّن میں شمار کیا ہے اور یہی بات زیادہ محقّق معلوم ہوتی ہے ان کا تعلق اہل سنت سے تھا اس لئے کہ ان کی تصنیفات میں حضرت علی کی شان ومنقبت کے ساتھ ساتھ خلفائے ثلاثہ یعنی خلیفہ اول حضرت ابوبکر،خلیفۂ دوم حضرت عمر اور خلیفۂ سوم حضرت عثمان کا ذکر بھی بڑے ادب واحترام کے ساتھ ملتا ہے ۔وجہی کے تاریخ پیدائش کی طرح ان سن وفات میں بھی کافی اختلاف ہے۔حمیرا جلیلی نے ان کا سنہ وفات ۱۰۷۶ھ سے ۱۰۸۳ھ کے درمیان قرار دیا ہے۔وجہی کے مدفن کے حضرت شاہ برہنہ کی درگاہ میں قرار دیا گیا جس کی تصدیق سب رس کے ایک مخطوطے سے ہوتی ہے لیکن اس کے بارے میں بھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

3.3.2 ملا وجہی کے ادبی کارنامے

ملا وجہی دکن کے مایہ ناز شاعر وادیب ہیں۔ان کی تصانیف نثر ونظم دونوں میں موجود ہیں۔ان تک ان کی طرف چھ تصانیف کی نسبت کی گئی ہے جن میں سے تین کے بارے میں تمام محققین کا اتفاق ہے کہ وہ ان ہی کی تصانیف ہیں جب کہ تین تصانیف کے سلسلے میں تحقیق نگار مختلف الرائے نظر آتے ہیں۔ان کی متفق علیہ کتب یہ ہیں۔نثر میں 'سب رس' اور نظم میں مثنوی 'قطب مشتری' اور 'دیوان وجیہہ فارسی' علاوہ ازیں ان کی مختلف فیہ کتب حسب ترتیب ہیں:'تاج الحقائق' مثنوی 'ماہ سیما و پری رخ'،'صراط مستقیم فی دین قویم' اور 'عقائد وجہی'۔

اب یہاں ملا وجہی کی کتب پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔جس سے شعر وادب کے باب میں ان کی علمی حیثیت کا اندازہ لگانا ممکن ہو جائے گا۔اس سے پہلے ہم ان کی طرف منسوب کتابوں کے متعلق جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں محققین کا کیا نظریہ ہے۔ان کی طرف منسوب پہلی کتاب تاج الحقائق ہے۔

تاج الحقائق

یہ ملا وجہی کی نثر میں پہلی تصنیف تاج الحقائق ہے۔اس کا موضوع تصوف کے نکات ومباحث ہیں۔

لیکن ان کی طرف اس کی نسبت کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔اکثر محققین نے اسے ملا وجہی کی تصنیف قرار دیا ہے جن میں مولوی عبدالحق،محمود شیرانی،عبدالقادر سروری اور اکبرالدین صدیقی جیسے ماہرین فن شامل ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر مسعود حسین نے اس کی تردید کی ہے۔اسی طرح نصیرالدین ہاشمی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اسے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف قرار دیا ہے۔ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور گیان چند جین نے اسے وجیہہ الدین گجراتی کی تصنیف مانا ہے۔اگر چہ تاج الحقائق کے مرتب ڈاکٹر نورالسعید نے اسے ملا وجہی کی تصنیف ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن ان کی تحقیق سے ماہر دکنیات حمیرا جلیلی بھی مطمئن نظر نہیں آتی جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب 'سب رس کی تنقیدی تدوین' میں کیا ہے۔وہ لکھتی ہیں:''ویسے یہ ممکن ہے کہ تاج الحقائق وجہی کی تصنیف ہو لیکن ابھی تک ایسی کوئی داخلی یا خارجی شہادت دستیاب نہیں ہوسکی جس کی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ اسے وجہی سے منسوب کرسکیں۔''

(سب رس کی تنقیدی تدوین،حمیرا جلیلی،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،۲۰۱۱ء،ص ۳۶)

مثنوی ماہ سیما و پری رخ

یہ وجہی کی طرف منسوب دوسری مثنوی ہے جس کا ذکر گارساں دتاسی نے اپنے مقالات میں کیا ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔پروفیسر ضامن علی نے اپنی کتاب 'جائزہ زبان اردو' میں محمد حفیظ الہ آبادی کے پاس اس کا ایک نسخہ موجود ہونے کی اطلاع بہم پہنچائی ہے لیکن وہ ہنوز پردۂ خفا میں ہے۔اس لئے جب تک تحقیق کے مرحلے سے گزر کر یہ ملا وجہی کی تصنیف ثابت نہ ہو جائے اسے منسوبات سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

دیوان وجیہہ فارسی

ملا وجہی کے تعلق سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اسے کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔وہ اردو ،عربی اور فارسی پر استادانہ مہارت رکھتا تھا جس کا ثبوت اس کی تصانیف سے عیاں ہے۔اس نے اردو تصانیف کے علاوہ فارسی میں بھی ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔اس کے فارسی دیوان کے تعلق سے حمیرا جلیلی رقم طراز ہیں: ''چنانچہ ان تمام امور کی مطابقت کی روشنی میں ہم قطعیت سے کہہ سکتے ہیں کہ فارسی دیوان قطب مشتری اور سب رس ایک ہی صاحب قلم کے زور طبع کا نتیجہ ہیں۔''(ایضاً ص ۱۱)

سب رس

نثر میں ملا وجہی کی سب سے معروف کا کتاب 'سب رس' ہے۔سب رس کو اردو زبان کی پہلی غیر مذہبی نثر کا نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔یہ ایک تمثیلی داستان ہے جس میں نظم و نثر کو ملا کر ایک نیا اسلوب ایجاد کیا گیا ہے جس نے اس کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔یہ داستان اگر چہ تخلیقی نہیں بلکہ فتاحی کے قصہ حسن و دل (نثر) سے ماخوذ ہے مگر

اس کو ملا وجہی نے اس قدر فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ اس کے تخلیقی ہونے کا ہی گمان ہوتا ہے۔ وجہی نے یہ کتاب عبداللہ قطب شاہ کی خصوصی فرمائش پر ۱۶۳۵ء میں تحریر کی تھی۔ اس کی اس تصنیف پر تمام محققین اور ناقدین نے داد دی ہے اور سب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ مختصر سی داستان اپنی جامعیت اور کاملیت میں اپنی نظیر آپ ہے۔

علاوہ ازیں ملا وجہی کی طرف دو اور کتابوں کی نسبت کی گئی ہے ایک 'صراط مستقیم فی دین قویم' اور 'عقائد وجہی' لیکن یہ کتابیں ابھی تک تحقیق کے مرحلوں سے نہیں گزری ہیں اس لئے ان کے تعلق سے کوئی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دونوں کتابیں واقعی وجہی کی تصانیف ہیں یا نہیں۔ ملا وجہی کی شہرت ان کی دو ہی تصانیف سے متعلق ہیں بقیہ تصانیف کے ثبوت یا عدم ثبوت سے ان کے ادبی مقام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے سب رس اور مثنوی قطب مشتری کافی ووافی ہیں۔

3.3.3 قطب مشتری کا جائزہ

ملا وجہی نے ۱۰۱۸ھ مطابق ۱۶۰۹ء میں اپنی مایہ ناز مثنوی تصنیف کی جس کو اس نے قطب مشتری نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب مولوی عبدالحق کی کوشش سے مرتب ہوکر ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس مثنوی کی عرصۂ تصنیف کے سلسلے میں ملا وجہی نے یہ دعویٰ کیا ہے اس نے یہ تخلیق محض بارہ دن میں مکمل کردی تھی:

تمام اس کیا دیس بارا منے　　سنہ ایک ہزار ہور اٹھارا منے

اس مثنوی کے قصے کے پس منظر کے سلسلے میں اکثر ناقدین اس بات کے قائل ہیں کہ یہ قصہ قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی محبت کی داستان پر مبنی ہے۔ لیکن بعض حضرات نے اسے صرف افسانوی قصہ مانا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ قلی قطب شاہ اور بھان متی کے معاشقے سے اس مثنوی کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ قصے کے پلاٹ کا حقیقت سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملا وجہی نے سلطان قلی قطب شاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مثنوی کے انداز میں بادشاہ کا ایک واقعاتی قصیدہ تحریر کیا ہے۔ اس میں اس نے ہیرو کو تعریف پر سب سے زیادہ زور صرف کیا ہے۔ گویا اس مثنوی کا اصل مقصد یہی ہے۔ مولوی عبدالحق قطب مشتری کے مقدمے میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وجہی کا مقصد اس مثنوی کے لکھنے سے بادشاہ کے حسن و جمال، شجاعت اور لیاقت کی تعریف کرنا ہے اور بس۔''

(قطب مشتری از ملا وجہی، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۳۸ء، ص ۳)

مثنوی کا آغاز روایتی انداز میں ہوتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے حمد، مناجات، نعت، ذکر معراج، منقبت حضرت علی، در صفت عشق گوید، در شرح شعر گوید، وجہی تعریف شعر خود گوید۔ یہ تمام عنوان مثنوی میں تمہیداً بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک عنوان ایسا ہے جس پر ہر ناقد نے وجہی کی تعریف کی ہے۔ وجہی اردو کا پہلا

ادیب ہے جس نے شعر گوئی پر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار اپنی اس مثنوی میں در شرح شعر گوید کے تحت کیا ہے جس میں اس نے شعر کی اصل خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔سب سے پہلے اس نے یہ بتایا ہے کہ شعر سلیس ہونا چاہیے اور شاعر کو بہت زیادہ شعر کہنے کی ہوس نہیں کرنی چاہیے بلکہ وہ ایک ہی شعر کہے پر اچھا کہے اور اس میں شعری نزاکتوں کی رعایت پائی جائے۔شعر میں لفظ و معنی کے درمیان ایسا ربط ہو کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم معلوم ہوں۔ملا وجہی کی زبانی اس کے تنقیدی خیالات ملاحظہ ہوں:

جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس — بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
جسے بات کے ربط کا فام نیں — اسے شعر کہنے سوں کچ کام نیں
نکو کر تو لئی بولنے کا ہوس — اگر خوب بولے تو یک بیت بس

اس طرح کی تمہیدی گفتگو کے بعد انھوں نے قصے کا آغاز کیا ہے۔اس مثنوی میں بھی قدیم داستانوں کی طرح ایک بادشاہ ابراھیم قطب شاہ ہے جسے ہر قسم کی دنیاوی آسائش حاصل ہے لیکن اسے صرف ایک بات کا غم ہے کہ وہ لاولد ہے اور اس کے بعد کوئی اس کی حکومت کو سنبھالنے والا نہیں ہے۔چنانچہ وہ اولاد کے حصول کے لئے تمام کوششیں کرتا ہے جس سے آخر کار اس کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔اس بچے کا نام قلی قطب شاہ رکھا جاتا ہے۔اس بادشاہ زادے کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ کی جاتی ہے جس سے یہ بچہ ہر طرح کے علم و فن میں ماہر، اعضا و جوارح سے نہایت مضبوط اور وجیہہ شہزادہ ہوتا ہے۔شہزادہ ابھی نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے کہ ایک رات محل میں عیش و مستی کی محفل سجی ہوئی تھی۔شراب و سرود کے مستی چھائی ہوئی تھی کہ شہزادے کی آنکھ لگ گئی۔اس نے ایک خواب دیکھا جس میں اسے ایک حسین و جمیل دوشیزہ دکھائی دی۔شہزادہ اس حسینہ کو خواب میں دیکھ کر اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔اس کی فریفتگی کا یہ عالم ہوا کہ وہ اس کی محبت میں پوری طرح سے محو ہو گیا اور اس نے اپنی محبوبہ کو تلاش کرنے کا عزم مصمم کر لیا۔شہزادے کی ضد کے آگے بادشاہ نے مجبور ہو کر اسے اپنے دوست عطارد کے ساتھ اپنی محبوبہ کو تلاش کرنے کی اجازت دے دی۔شہزادے نے عطارد سے جب اس حسینہ کا وصف بیان کیا تو عطارد نے اسے ایک تصویر دکھائی اور بتایا کہ یہ بنگالہ کی شہزادی ہے جس کی تلاش میں وہ دونوں نکل پڑتے ہیں اور راستے میں پیش آنے والی تمام پریشانیوں کو عبور کرتے ہوئے بڑی مشکل سے وہ شہزادی تک پہنچتے ہیں اور اسے بنگالہ سے گولکنڈہ لے کر آتے ہیں جہاں بڑی دھوم دھام سے ان کی شادی ہوتی ہے۔اس طرح دکن کے شہزادے اور بنگالہ کی شہزادی کے وصال پر یہ مثنوی اختتام کو پہنچتی ہے۔پوری مثنوی اسی پلاٹ کے ارد گرد گھومتی نظر آتی ہے۔

مثنوی کے قصہ کا تعلق تو حقیقی انسانوں سے ہے لیکن پوری مثنوی میں مافوق الفطرت کرداروں کی بھرمار ہے جس نے مثنوی کے تاثر کو مجروح کر دیا ہے۔مثنوی کی شروعات ایک خواب سے ہوتی ہے جس میں شہزادہ ایک حسینہ کو دیکھتا اور اس پر مرمٹتا ہے لیکن اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی محبوبہ کو کیسے اور کہاں تلاش کرے حتیٰ کہ عطارد

اس کے سامنے آتا ہے شہزادہ اسے اپنی پریشانی بتاتا ہے اور وہ اسے ایک تصویر دکھاتا ہے اور کہتا ہے یہ تو بنگالہ کی شہزادی ہے۔ چنانچہ وہ دونوں اس کے حصول کے لئے سفر پر نکل پڑتے ہیں۔ اس سفر میں شہزادے کو قدم قدم پر مصیبتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر طرف سے مافوق الفطرت عناصر اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور عجیب و غریب کردار سامنے آتے ہیں جن کو انسانی ذہن تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ مثلاً اس سفر میں ایک عجیب ہیئت کا اژدہا جو منھ سے آگ اگلتا ہے وہ شہزادے کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے جسے سخت مقابلے کے بعد ہرا پاتا ہے۔ پھر ایک عجیب الخلقت دیو سامنے آتا ہے جس کے تین سر، چار ہاتھ اور بڑے بڑے دانت ہیں۔ وہ ہر صبح نو ہاتھیوں کا ناشتہ کرتا ہے۔ اس کو ہرانے کے لئے شہزادہ آیت الکرسی کا حصار باندھتا ہے اس طرح وہ اس خطرناک دیو کو قتل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

مثنوی کا ہیرو یعنی شہزادے کا جو نقشہ صاحب مثنوی نے کھینچا ہے وہ محض خیالی معلوم ہوتا اس لئے کہ جب شہزادہ میدان عمل میں آتا ہے تو بہت ہی بے بس اور لاچار دکھائی پڑتا اور اسے قدم قدم پر عطارد کی مدد درکار ہوتی۔ یا پھر اسے ہر موقعے پر کسی پیر، فقیر یا خضر کا انتظار رہتا جس کی دعا یا تعویز اور منتر سے وہ ان مافوق الفطرت عناصر کو شکست دینے میں کامیاب ہو سکے۔ وجہی نے قطب شاہ کے کردار کو پیش کرنے کے لئے ایسی خیالی اور طلسماتی دنیا کی تخلیق ہے جس سے شہزادے کے حقیقی اوصاف و کردار سامنے آنے کے بجائے اسے مافوق الفطرت طاقتوں پر انحصار کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس میں بیان و عمل کا تضاد دکھائی دیتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شہزادے کا علم و فن اس کی ذہانت و فطانت اور جنگی مہارت کی باتیں محض نمائشی ہیں آزمائش کے وقت کسی کام نہیں آتیں۔ چنانچہ کردار کے اوصاف اور اس کے اعمال متضاد ہونے کہ وجہ سے مثنوی فطری طور پر آگے بڑھتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اس مثنوی میں بنیادی پر گیارہ کردار پیش کئے گئے ہیں۔ ابراھیم قطب شاہ، قلی قطب شاہ، عطارد، مشتری، زہرہ، مریخ خاں، شاہ سرطان، وزیر اسد خاں، مہتاب پری سلکھن پری، مہرواں دائی۔ لیکن اس کے ایک دو کردار ہی متحرک و فعال نظر آتے ہیں۔ جب کہ مرکزی کردار شہزادہ دوسروں پر منحصر نظر آتا ہے۔ شہزادے کے کردار میں جو بات سب سے زیادہ سچی اور حقیقی دکھائی پڑتی ہے وہ عشق میں اس کی سچائی ہے جو اسے کسی بھی حال میں محبوب تک پہنچنے پر ابھارتی رہتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور اس کے پائے ثبات میں کسی بھی مرحلے پر لغزش نہیں آتی۔

مثنوی کا دوسرا مرکزی کردار 'مشتری' کا ہے۔ جو اپنے اوصاف و کردار میں بہت حد تک سچی نظر آتی ہے۔ وہ خوبصورت، سخی اور وفا شعار ہے اور اسی بنا پر وہ اپنے محبوب کے ساتھ ایک انجان ملک میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر چلے آنے کے لئے راضی ہو جاتی ہے۔ یہ اس کے وفا شعاری اور اعلیٰ کردار کی نشانی ہے۔

اس مثنوی کی سب سے اہم خصوصیت اس کا اسلوب اور زبان و بیان ہے۔ اس سلسلے میں وجہی نے اپنی

استادانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔اس میں تشبیہات واستعارات برجستہ اور برمحل ہیں۔قوافی ومترادفات کا بخوبی استعمال کیا گیا ہے۔کرداروں کے درمیان ہونے والے مکالمے اپنی حیثیت اور مرتبے کے مطابق ہیں۔ان میں جذبات واحساسات کی تپش اور ماحول اور منظر کی پوری عکاسی پائی جاتی ہے۔ایک موقع پر عطار شہزادے کو سمجھاتے ہوئے نصیحت کرتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز خوبصورت ہے بس آپ کو جو پسند آجائے آپ اسی کو خوبصورت سمجھنے لگتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کی دوسرے چیزیں خراب ہیں بلکہ ان میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی موجود ہوتی ہے جسے ہم سمجھ نہیں پاتے۔عطار کی اس نصیحت کو وجہی نے بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے:

پھلاں ہور خوباں یو یک ذات ہے　　کہ یک رنگ یک روپ یک دھات ہے
کسے باس ہے ہور کسے رنگ ہے　　کسے باس ہور رنگ بھی سنگ ہے
کسی میں سو چھند بند ہور ناز بھوت　　کسی میں صورت شکل کا ساز بھوت
کسے میں برا کوں کسے میں سراووں　　کہ خوباں ہے شہ خوب سب اپنے ٹھاووں

تشبیہ واستعارے میں بھی اس نے کافی صناعی سے کام لیا ہے اور اس کی تشبیہات کی دو مثالیں دیکھیں جس میں اس نے زلف اور چشم کی کیفیات کو بیان کیا ہے کہ محبوب کی زلفیں اس کے چہرے پر بکھر گئی ہیں اور اس کے پیچھے سے اس کی آنکھیں جھانک رہی ہیں گویا یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی جال میں دو مچھلیاں پھنس گئی ہوں:

اچھیں نین اس کیس کالے منے　　کہ مچھلیاں دو سنپڑ یاں ہیں جالے منے

اسی نقشے کی تشبیہ اس نے دوسری جگہ الگ طریقے پر بیان کی ہے کہ اس کی آنکھیں بالوں کے پیچھے سے ایسی نظر آتی ہیں جیسے بادلوں میں بجلیاں چمکتی ہیں:

اچھلتیاں ہیں بجلیاں ابھالاں تلے　　کہ نیناں جھمکے ہیں بالاں تلے

وجہی نے اس مثنوی میں زبان و بیان اور مکالمے کے علاوہ منظر نگاری میں بھی کمال دکھایا ہے۔اس کی منظر نگاری ایسی حقیقی ہے کہ قاری کی نظروں کے سامنے پوری تصویر گھوم جاتی ہے۔مثلاً اس نے مثنوی میں ایک باغ کا نقشہ اس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ مثنوی پڑھنے والا اپنے آپ کو اس باغ میں موجود پاتا ہے جہاں اس کے آس پاس ہر قسم کے پھل پھول اگے ہوئے ہیں جس نے فضا کو ایسا معطر کر دیا کہ اس کی خوشبو دماغ میں بس جاتی ہے۔جہاں بنفشہ کی زلفیں مشک بار ہیں اور سرو مستی میں رقص کر رہے ہیں۔مرغان چمن کی آوازیں نغمات بن کر بلند ہو رہی ہیں اور کلیاں صراحیاں اور پھول کٹورے بنے ہوئے ہیں۔جہاں سانولی سلونی بلبلیں اپنی شوخ باتوں اور دلچسپ حرکتوں سے مور،طوطے اور ہنس کو ہنساتے ہوئے لوٹ پوٹ کر رہی ہیں:

یکا یک دسیا ایک نزدیک باغ　　ہوا اس کے باساں تے ترسب دماغ
کہ پاتاں کے پردیاں کو سب پھاڑ کر　　پھلاں جھانکتے تھے سراں کاڑ کر

بنفشہ مشک پائی تھی بال میں	سر ورقص کرتے تھے آ حال میں
سر وداں سومرغاں کے نالے تھے واں	صریاں کلیاں پھول پیالے تھے واں
سورنگ سانو لے خوب باتاں بھرے	ندیم ہو کے بلبل جو چالے کرے
سوطاؤس پنکھی طوطی کبک ہنس	پکڑ پیٹ لڑنے لگے ہنس ہنس

ملا وجہی نے اس مثنوی میں اس زمانے کی تہذیب و معاشرے کو بہت خوبی سے پیش کیا جس میں اس عہد کے دربار کا ماحول ،محلوں کی تزئین و آرائش ، بادشاہوں کا عوام کے ساتھ سلوک ،اس دور کے رسم و رواج ،اقدار و روایات ،غذا اور رہن سہن ،لوگوں کے مسائل اور ان کے معاشی حالات وغیرہ کی اچھی خاصی تفصیلات مل جاتی ہیں ۔اس سے اس مثنوی کی تاریخی اہمیت بھی ثابت ہوتی ہے ۔وجہی نے اپنی اس مثنوی میں جذبات نگاری اور نفسیات کے بھی اچھے نمونے پیش کئے ہیں جو مثنوی کی اہمیت کو بڑھاتے ہیں ۔ان تمام خوبیوں کے باوجود مثنوی میں پلاٹ اور کردار نگاری کے کمزور ہونے کا شکوہ تمام ناقدین نے کیا ہے لیکن اس کے باوجود ملا وجہی کی یہ مثنوی اردو ادب میں ہمیشہ اپنی خوبیوں کے لئے یاد رکھی جائے گی ۔

3.4.3 خلاصہ

ملا وجہی قطب شاہی دور کے مشہور و معروف نثر نگار اور قادر الکلام شاعر ہیں ۔ان کے آبا و اجداد خراسان سے ہجرت کر کے گولکنڈہ میں آباد ہوئے چونکہ یہ خاندان علم وفضل میں معروف تھا اس لئے ابتدا ہی سے اسے حکومت میں مناصب ملتے رہے ہیں ۔اسی خاندان میں ملا وجہی نے ابراھیم قطب شاہ عہد حکومت (۱۵۸۰ء۔ ۱۵۵۰ء) میں آنکھیں کھولیں ۔انھوں اپنی زندگی میں چار بادشاہوں کا زمانہ پایا ۔خاندان والوں نے ان کا نام اسد اللہ رکھا اور ان کا تخلص وجہی تھا ۔ملا وجہی کا خاندان اہل علم وفضل کا خاندان تھا اس لئے ان کی تعلیم تربیت نہایت عمدہ ہوئی جس پر ان کے ادبی کارنامے دلالت کرتے ہیں ۔ملا وجہی کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا لیکن ان کے فن کی قدر قلی قطب شاہ کے عہد حکومت میں ہوئی ۔اس کے دربار سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ترقی ہوتی رہی حتیٰ کہ وہ ملک الشعرا کے منصب سے سرفراز کئے گئے ۔انھوں نے قلی قطب شاہ کی تعریف میں مثنوی 'قطب مشتری' تحریر کی اور محمد قطب شاہ کی فرمائش پر 'سب رس' لکھی ۔ ملا وجہی کا انتقال حمیرا جلیلی کے مطابق ۱۰۷۶ھ سے ۱۰۸۳ھ کے درمیان ہوا اور وہ حضرت شاہ برہنہ کی درگاہ میں مدفون ہوئے ۔

ملا وجہی نے ادب میں کئی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے تین تخلیقات کے بارے میں پورے وثوق سے کہا جاتا ہے کہ یہ ان کی تصنیفات ہیں ۔نثر میں 'سب رس' اور نظم میں مثنوی 'قطب مشتری' اور 'دیوان وجیہہ فارسی ۔جب کہ چار کتابیں ان کی طرف منسوب ہیں جن کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا یہ ان کی تصنیفات ہیں یا نہیں وہ چار کتابیں یہ ہیں ۔'تاج الحقائق' مثنوی 'ماہ سیما و پری رخ'، 'صراط مستقیم فی دین

قویم' اور 'عقائد وجہی'۔ ملا وجہی کی اصل شہرت ان کی دو کتابوں کی وجہ سے ہے ایک 'سب رس' جو اردو میں پہلی غیر مذہبی نثر کا عمدہ نمونہ ہے۔ دوسری ان کی مشہور مثنوی 'قطب مشتری' جس میں انھوں نے قلی قطب شاہ کی عشقیہ داستان رقم کی ہے۔ یہ تصنیف بھی زبان و بیان کے لحاظ سے بہت اعلیٰ پائے کی ہے۔ اگر چہ ابتدائی نمونہ ہونے کے اعتبار سے اس میں کچھ خامیاں پائی جاتی ہیں اس کے باوجود اس کی دیگر خوبیوں اور تاریخی اہمیت کے سامنے وہ کمیاں زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ ان کی یہ تصنیف اردو مثنوی کی روایت میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔

3.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کے مطالعے سے آپ نے

ملا وجہی کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کی۔

ملا وجہی کے ادبی کارناموں سے آشنائی حاصل کی۔

ملا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' کا تجزیہ کیا۔

3.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1. ملا وجہی کے سوانحی کوائف اختصار کے ساتھ بیان کریں؟
2. ملا وجہی کی تمام تصانیف کے نام تحریر کریں؟
3. ملا وجہی کتاب سب رس پر ایک مختصر نوٹ لکھیں؟
4. ملا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' پر مختصر نوٹ لکھیں؟
5. ملا وجہی نے کن چار بادشاہوں کا زمانہ پایا ان کے نام بتائیں؟

3.6 سوالات کے جوابات

1. ملا وجہی قطب شاہی دور کے مشہور و معروف نثر نگار اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کے آبا و اجداد خراسان سے ہجرت کر کے گولکنڈہ میں آباد ہوئے چونکہ یہ خاندان علم و فضل میں معروف تھا اس لئے ابتدا ہی سے اسے حکومت میں مناصب ملتے رہے ہیں۔ اسی خاندان میں ملا وجہی نے ابراھیم قطب شاہ عہد حکومت (۱۵۸۰ء۔۱۵۵۰ء) میں آنکھیں کھولیں۔ انھوں اپنی زندگی میں چار بادشاہوں کا زمانہ پایا۔ خاندان والوں نے ان کا نام اسد اللہ رکھا اور ان کا تخلص وجہی تھا۔ ملا وجہی کا خاندان اہل علم و فضل کا خاندان تھا اس لئے ان کی تعلیم تربیت نہایت عمدہ ہوئی جس پر ان کے ادبی کارنامے دلالت کرتے ہیں۔ ملا وجہی کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا لیکن ان کے فن کی قدر قلی قطب شاہ کے عہد حکومت میں ہوئی۔ اس کے دربار سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ترقی ہوتی رہی حتیٰ کہ وہ ملک الشعرا کے منصب سے سرفراز کئے گئے۔ انھوں نے قلی قطب شاہ کی تعریف میں مثنوی 'قطب مشتری' تحریر کی اور محمد قطب شاہ کی فرمائش پر 'سب رس' لکھی۔ ملا وجہی کا انتقال حمیر اجلیلی

کے مطابق ۱۰۷۶ھ سے ۱۰۸۳ھ کے درمیان ہوا اور وہ حضرت شاہ برہنہ کی درگاہ میں مدفون ہوئے۔

2. سب رس، 'قطب مشتری'، 'دیوان وجیہہ فارسی' 'تاج الحقائق'، 'ماہ سیما و پری رخ'، 'صراط مستقیم فی دین قویم' اور 'عقائد وجہی'۔

3. نثر میں ملا وجہی کی سب سے معروف کا کتاب 'سب رس' ہے۔ سب رس کو اردو زبان کی پہلی غیر مذہبی نثر کا نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک تمثیلی داستان ہے جس میں نظم و نثر کو ملا کر ایک نیا اسلوب ایجاد کیا گیا ہے جس نے اس کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔ یہ داستان اگر چہ تخلیقی نہیں بلکہ فتاحی کے قصہ حسن و دل (نثر) سے ماخوذ ہے مگر اس کو ملا وجہی نے اس قدر فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ اس کے تخلیقی ہونے کا ہی گمان ہوتا ہے۔ وجہی نے یہ کتاب عبداللہ قطب شاہ کی خصوصی فرمائش پر ۱۶۳۵ء میں تحریر کی تھی۔ اس کی اس تصنیف کی داد تمام محققین اور ناقدین نے دی ہے اور سب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ یہ مختصر سے داستان اپنی جامعیت اور کاملیت میں اپنی نظیر آپ ہے۔

4. ملا وجہی نے ۱۰۱۸ھ مطابق ۱۶۰۹ء میں اپنی مایہ ناز مثنوی تصنیف کی جس کو اس نے قطب مشتری نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب مولوی عبدالحق کی کوشش سے مرتب ہو کر ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس مثنوی کی عرصۂ تصنیف کے سلسلے میں ملا وجہی نے یہ دعویٰ کیا ہے اس نے یہ تخلیق محض بارہ دن میں مکمل کر دی تھی۔

اس مثنوی میں بیان کردہ قصے کے پس منظر کے سلسلے میں اکثر ناقدین اس بات کے قائل ہیں کہ یہ قصہ قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی محبت کی داستان پر مبنی ہے۔ لیکن بعض حضرات نے اسے صرف افسانوی قصہ مانا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ قلی قطب شاہ اور بھان متی کے معاشقے سے اس مثنوی کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا اس لئے کہ قصے کا پلاٹ حقیقت سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملا وجہی نے سلطان قلی قطب شاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مثنوی کے انداز میں بادشاہ کا ایک واقعاتی قصیدہ تحریر کیا ہے۔ جس میں اس نے ہیرو کو تعریف پر سب سے زیادہ زور صرف کیا ہے۔ گویا اس مثنوی کا اصل مقصد یہی ہے۔

اس مثنوی میں ملا وجہی نے دکن کے شہزادے اور بنگالہ کی شہزادی کو مرکزی کردار میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس مثنوی کے کردار اپنے اوصاف و اعمال میں متضاد معلوم ہوتے ہیں۔ فنی لحاظ سے اس مثنوی میں مکالمہ نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں جس میں ملا وجہی نے کرداروں کی حیثیت اور ان کے مقام و مرتبے کا خصوصی لحاظ رکھا ہے۔ مثنوی میں منظر نگاری کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں جن کو پڑھ قاری کے آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھومنے لگتے ہیں۔ وجہی نے اس داستان کے ضمن میں دکن کی تہذیب و ثقافت اور وہاں کے معاشرے کی عمدہ تصویر کشی کی ہے جس سے اس مثنوی کی تاریخی حیثیت مسلم ہو جاتی ہے۔ ملا وجہی نے اس مثنوی میں زبان و بیان کو بہت استادانہ مہارت

سے برتا ہے جس سے اس میں سلاست وروانی کا ایک دریا موجزن نظر آتا ہے۔انھوں نے ثقیل الفاظ کی جگہ اردو فارسی اور ہندی کے سبک وشیریں الفاظ سے اس مثنوی کے اسلوب میں چار چاند لگا دیے ہیں۔اگر چہ اس مثنوی میں پلاٹ وکردار نگاری کے باب میں کچھ سقم پایا جاتا مگر دوسرے اجزا اس کی بھر پائی کرتے نظر آتے ہیں۔اس لئے اردو ادب میں اس مثنوی کو ہمیشہ ملا وجہی کے شاہکار کے طور پر مقبولیت حاصل رہے گی۔

5. ملا وجہی نے اپنے زندگی میں چار بادشاہوں کا زمانہ پایا ہے۔ابرھیم قطب شاہ،محمد قلی قطب شاہ،محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ۔

3.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
قیاس	اندازہ
دخیل	عمل دخل رکھنے والا،صاحب اختیار
ملک الشعرا	شاعروں کا بادشاہ،ایک خطاب جو شاہی دربار کے بڑے شاعر کو دیا جاتا ہے۔
تعلّی	شاعر کا اپنی تعریف کرنا،اپنی بڑائی جتانا
معاصرین	ہم زمانہ
مقرّب	قریبی،رازدار،
بدظن	برا گمان،شک وشبہ
مطلع	طلوع ہونے کی جگہ،غزل کا پہلا شعر
معزولیت	برطرفی،عہدے سے ہٹ جانا
دیباچہ	کتاب کا مقدمہ،شروعات،ابتدا
مسلک	چلنے کا راستہ،مذہب،عقیدہ
اہل تسنّن	اہل سنت والجماعت،مسلمانوں کا ایک فرقہ جو خلفائے ثلاثہ کو برحق مانتا ہے اور حضرت علی کو چوتھا خلیفہ مانتا ہے۔
اہل تشیّع	شیعہ،مسلمانوں کا ایک فرقہ جو حضرت علی کو پہلا امام مانتا ہے۔
متفق علیہ	جس پر سب کا اتفاق ہو
مختلف فیہ	جس میں اختلاف ہو

نِکات	نکتہ کی جمع، باریکیاں،لطیف باتیں
مباحث	بحث کا مقام،بحثیں
تردید	رد کرنا، بات کاٹ دینا
تدوین	ترتیب دینے کا کام، کتاب مرتب کرنا
تمثیل	مثال، کسی واقعہ کا مثالی انداز میں بیان،
عزم مصمّم	پختہ ارادہ
مافوق الفطرت	جس کو حواس سے نہ جانا جا سکے، غیر معمولی سے، کرشمہ
تزئین	سجانا، سنوارنا

3.8 کتب برائے مطالعہ

1. قطب مشتری	مرتبہ مولوی عبدالحق
2. اردو کی تین مثنویاں	پروفیسر خاں رشید
3. حیات وجہی	م۔ن۔سعید
4. سب رس کی تنقیدی تدوین	حمیرا جلیلی
5. اردو مثنوی کا ارتقا	عبدالقادر سروری

اکائی4. میراثر: حیات، ادبی کارنامے اور خواب وخیال کا جائزہ

ساخت

1.4 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 میراثر: حیات، ادبی کارنامے اور خواب وخیال کا جائزہ

4.3.1 میراثر: سوانحی کوائف

4.3.2 میراثر کے ادبی کارنامے

4.3.3 خواب وخیال کا جائزہ

4.3.4 خلاصہ

4.4 آپ نے کیا سیکھا؟

4.5 اپنا امتحان خود لیجئے

4.6 سوالات کے جوابات

4.7 کلیدی الفاظ

4.8 کتب برائے مطالعہ

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

میراثر کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کریں گے۔

میراثر کے ادبی کارناموں سے متعارف ہوں گے۔

میراثر کی مثنوی خواب وخیال کا جائزہ لیں گے۔

4.2 تمہید

طلبائے گرامی! گزشتہ اکائی میں آپ ملا وجہی کے سوانحی کوائف اور ادبی خدمات سے واقف ہوئے ہیں ۔اس میں آپ نے ملا وجہی کی حیات ان کی تصنیفات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور آخر میں آپ نے ان کی مثنوی 'قطب مشتری' کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔اب اس اکائی میں آپ شمالی ہند کے معروف مثنوی نگار میراثر کے سوانحی

کوائف،ان کی ادبی خدمات اور آخر میں ان کی مثنوی 'خواب وخیال' سے آگہی حاصل کریں گے۔

4.3 میر اثر: حیات، ادبی کارنامے اور خواب وخیال کا جائزہ

4.3.1 میر اثر: سوانحی کوائف

خواجہ میر اثر کا اصل نام محمد میر ہے اثؔر ان کا تخلص ہے۔ وہ خاندان کے اعتبار سے نجیب الطرفین سادات ہیں۔ والد کی طرف سے ان کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے اور والدہ کی جانب سے حضرت سید عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ ان کا خاندان بخارا سے ہندوستان اورنگ زیب کے زمانۂ حکومت میں آیا۔ ان کے جد امجد خواجہ فتح اللہ ہیں جن کی شادی اورنگ زیب نے نواب سربلند خاں بخشی اول کی بیٹی سے کرائی تھی۔ اس سادات خاندان کے اورنگ زیب سے خاندانی مراسم تھے۔ اس وجہ سے انھیں حکومت میں اعلیٰ مناصب حاصل ہوتے رہے۔ خواجہ فتح اللہ کے بیٹے نواب ظفر اللہ خاں ہیں جو میر ناصر عندلیب کے والد اور میر درد اور میر اثر کے دادا ہیں۔ میر اثر کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے شاہ سعد اللہ گلشن سے شعر وادب، موسیقی اور روحانیت میں فیض حاصل کیا تھا۔ خواجہ ناصر عندلیب کی دوسری بیوی سے تین بیٹے تولد ہوئے۔ خواجہ میر دردؔ، سید میر محمد اور خواجہ محمد میر اثؔر۔ خواجہ میر اثر کی پیدائش ۱۱۴۸ھ میں ہوئی۔

میر اثؔر کی تعلیم وتربیت خواجہ میر درد کے زیر سایہ ہوئی علاوہ ازیں انھوں دہلی کے دوسرے علماء سے بھی علم حاصل کیا۔ وہ تصوف، موسیقی اور ریاضی میں ماہر تھے۔ انھوں نے ریاضی کا علم اس دور کے معروف ریاضی داں خواجہ احمد دہلوی سے سیکھا۔ شاعری میں انھوں خواجہ میر دردؔ سے اصلاح لی ان کی پوری شاعری پر میر درد کی شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ میر اثر کے والد میر ناصر کا انتقال ۱۱۷۲ھ میں ہوا۔ اس کے بعد ان کے جانشین وخلیفہ میر درد ہوئے۔ میر اثر خواجہ میر درد سے بیعت ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ انھوں نے دردؔ کے علمی و روحانی کام کو خوب فروغ دیا۔

خواجہ میر اثر کی شادی ۱۱۶۲ھ میں ہوئی جس سے ان کے یہاں ایک بیٹی ہوئی جس کا نام بیگم جان تھا۔ ان کی شادی نواب سید اسد اللہ خاں بن نواب سید جعفر علی خاں سے ہوئی تھی۔

میر اثر کا انتقال ۱۲۰۹ھ میں ہوا اور انھیں ان کے بھائی خواجہ میر درد کے بغل میں دفن کیا گیا۔

4.3.2 میر اثر کے ادبی کارنامے

خواجہ میر اثؔر خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ انھوں نے شاعری میں میؔر درد سے اصلاح لی اور ان ہی کی مرید وجانشین ہوئے۔ میر اثر نے اردو میں تین ادبی کارنامے یادگار چھوڑے ہیں جن کے اسماء یہ ہیں: 'دیوان اثر' (اردو) مثنوی 'بیان واقع' اور 'مثنوی خواب وخیال'۔ میر اثر کے فارسی دیوان کے ہونے کی بھی اطلاع ملتی ہے

لیکن ابھی تک اس کا کوئی قلمی نسخہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔اس لئے ان کی تین تخلیقات سے یہاں بحث کی جائے گی۔

ا۔دیوان اثر

خواجہ میر اثر کا دیوان بھی ان کے برادے کلاں خواجہ میر درد ہی کی طرح مختصر اور بہت ہی جامع ہے۔ جس طرح میر دردؔ کا کلام حشو زوائد سے پاک ہے اسی طرح میر اثر کا کلام میں بھی غیر ضروری چیزیں نہیں پائی جاتی ہیں۔وہ پوری طرح سے پاک وصاف اور گوہر آبدار کے مثل معلوم ہوتا ہے۔جو زبان کی شیرینی، اسلوب کی سادگی، مضمون کی بلندی اور روزمرہ اور آسان زبان وبیان کے باعث سلک گوہر بن گیا ہے۔ڈاکٹر کامل قریشی نے اپنی تحقیق کے مطابق ان کے کل کلام کی فہرست مرتب کی جو حسب ذیل ہے:

''ا۔غزلیات	۱۳۳
۲۔ناتمام غزلیات	۹
۳۔فردیات (ا) مطلع	۳۹
(۲) متفرق اشعار	۹
۴۔قطعات	۱۲
۵۔رباعیات (اردو)	۴۶
۶۔رباعیات (فارسی)	۱۳
۶۔ابیات ومثنوی شجرۂ طیبہ (فارسی)	۸

اس تفصیل کی روشنی میں دیوان اثر کی ضخامت تقریباً دیوان دردؔ کے برابر ہی ہے۔''

(دیوان اثر، مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دلی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۰۷)

اثر کے دیوان میں تغزل کی چاشنی، نکتہ آفرینی، تصوف کے نکات ومباحث اور معاملات عشق کی بوقلمونی پائی جاتی ہے۔اثر نے زبان وبیان کے تئیں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔انھوں نے تصوف کے ژلیدہ اور پیچیدہ مسائل کو آسان اور سہل انداز میں ایسی فنی چابکدستی سے بیان کیا ہے کہ ہر شعر دل میں اترتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ان کے پورے دیوان میں مشکل اور پیچیدہ اشعار تلاش کرنے پر بھی مشکل سے ملتے ہیں۔حتیٰ کہ انھوں نے تصوف کی گنجلک اصطلاحوں اور اس کے نازک مسائل اور فلسفیانہ رموز کو بھی بہت کمال کے ساتھ شیریں آسان اور سادہ الفاظ میں پیش کیا ہے۔میر اثر کی باتیں دل کی باتیں ہیں اور وہ اسے دل کی ہی زبان سے اسے ادا کرتے ہیں۔ان کی سادگی میں پرکاری کا عنصر پایا جاتا ہے۔ان کی بے خودی ہوشیاری کا آئینہ ہے۔ان کے جذبات عشق اصلیت پر مبنی ہیں۔ان کے بہت سے اشعار سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہیں۔ان کا کلام دل کو جہاں ایک طرف نشتر کی طرح دل کو چیرتا ہے وہاں دوسری طرف وہ زخمی دل پر مرہم رکھنے کا بھی کام کرتا ہے۔اثر نے زندگی بہت قریب سے

دیکھا اور برتا ہے۔ زمانے کی آزمائشوں اور کلفتوں نے ان پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں اور گردش زمانہ کے تلخ تجربات سے وہ دوچار ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ اس کا اظہار بہت ہی حقیقی انداز میں کرتے ہیں گویا وہ اپنے الفاظ کے ذریعے اس کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ ان کا دل عشق کی آگ میں جل کر کیمیا بن چکا ہے۔ اس لئے عشقیہ جذبات کے اظہار میں جو سوز و ساز اور خلوص دکھتا ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے۔ ان کے کلام کے تعلق سے محمد مبین کیفی چریا کوٹی نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''اثر کی شاعری دردؔ کا آئینہ ہے جو کچھ وہ کہتے ہیں بے ساختگی سے کہتے ہیں لیکن لوازم شاعری سے بے خبر نہیں رہتے، زبان بھی ایسی میٹھی کہ قند گھولتے ہیں، محاورات دلنشین سے دلوں پر اپنا سکہ بٹھاتے ہیں، غزل میں عشق، تصوف، اخلاقیات، پند و نصائح، سب کچھ اس انداز میں کہتے ہیں کہ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ پند و نصائح کی تلخی میں طرز ادا کی شیرینی اس طرح ملا دیتے ہیں کہ غذائے روحانی بن جاتی ہے۔ خواجہ میر درد کی طرح مختصر الفاظ میں وسیع معانی پہناتے ہیں اور معمولی ترکیبوں میں طلسم بندی کا لطف دکھاتے ہیں۔''

(جواہر سخن (جلد دوم)، مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی، ہندوستانی اکیڈیمی، الہ آباد، ص ۴۶۷)

میر اثر کے دیوان میں تین طرح کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ اپنے بڑے بھائی خواجہ میر درد کا مکمل تتبع کرتے ہیں جس سے ان کی شاعری میں بھی وہی خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں جو میر درد کا اختصاص ہیں۔ درد نے سادہ و آسان زبان میں عشق و تصوف کے اعلیٰ مضامین کو جس مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ان ہی کا خاصہ ہے۔ سہل ممتنع ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ چھوٹی بحروں میں بلند مضامین سادہ الفاظ میں ادا کرنا بہت کوشش اور فنی پختگی کے بغیر ممکن نہیں لیکن دردؔ نے اس سنگلاخ زمین کو بآسانی طے کیا ہے اور انھیں کی پیروی میں میر اثر نے بھی یہی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ان کے اشعار میں پائی جانے والی روانی کو سمجھنے کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تیرے آنے کا احتمال رہا — مرتے مرتے یہی خیال رہا
غم ترا دل سے کوئی نکلے ہے — آہ ہر چند میں نکال رہا
ہجر کے ہاتھ سے ہیں سب روتے — یاں ہمیشہ کسے وصال رہا
پھر نہ کہنا اثرؔ نہ کچھ سننا — کوئی دن گر یونہیں جو حال رہا

ان کے کلام کی دوسری خصوصیت عاشقانہ مضامین کی جیتی جاگتی اور سچی تصویر کشی ہے۔ اثر نے کثرت کے ساتھ مجازی عشق کے تعلق سے اشعار کہے ہیں۔ ان کا عشق ارضی ہے اور وہ گوشت پوست والا معشوق رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے عشق حقیقی کی بھی اتنی ہی عمدہ عکاسی کی ہے گویا یہ سب ان کی واردات قلبی کا بیان ہے۔

ان کے اشعار کی تیسری خصوصیت صوفیانہ مضامین کا بیان ہے۔ اثر صوفیہ کے گھرانے میں پیدا ہوئے اور ان کی

تربیت بھی خواجہ میر درد کے زیرِ سایہ ہوئی جس سے انھیں تصوف کے رموز و اشارات سے مکمل آگہی حاصل ہوئی۔اسی کا نتیجہ تھا کہ تصوف ان کی زندگی کا لابدی حصہ بن گیا تھا۔اسی بنا پر انھوں نے تصوف کے مضامین کو بہت کمال کے ساتھ برتا ہے۔

اثر کی دوسری تصنیف مثنوی 'بیان واقع' ہے جو کہ فارسی زبان میں تھی۔ابھی تک اس کا کوئی مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہوگئی ہے۔اب اس کے صرف پانچ چھوٹے بڑے اقتباسات ناصر نذیر فراقؔ کی کتاب میخانۂ درد میں ملتے ہیں۔ میخانۂ درد میں درج اقتباسات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر کامل قریشی لکھتے ہیں:

''میخانۂ درد میں بیان واقع کے پانچ مختصر وطویل اقتباسات کے ذریعہ اثرؔ نے اپنے نسب نامۂ پدری ،اپنے نانا میر محمد قادری کی تاریخ وفات ،اپنے والد میر ناصر عندلیبؔ کا روحسن علیہ السلام سے فیض روحانی،صدق و صفا اور رشد و ہدایت کی راہ میں ان کے معمولاتِ شب و روز کے علاوہ اپنے برادر بزرگ میر محفوظ کی تاریخ وفات کا اس صورت سے بیان کیا ہے کہ ان کے خاندانی حالات و واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔''

(دیوان اثر،مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی،انجمن ترقی اردو ہند،نئی دلی،۱۹۷۸ء،ص۹۱)

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے مثنوی 'بیان واقع' کا تعلق ان کے خاندانی حالات سے ہے۔جس میں انھوں نے اپنے بزرگوں اور بھائیوں کے تعلق سے معلومات فراہم کی ہیں۔

خواجہ میر اثر کی تیسری تصنیف مثنوی 'خواب و خیال' ہے یہ مثنوی ان کی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔اس کا تفصیلی تجزیہ اگلے باب میں پیش کیا جا رہا ہے۔

4.3.3 خواب وخیال کا جائزہ

میر اثر کی یہ مثنوی روایتی انداز کی مثنوی سے بالکل مختلف ہے۔عموماً مثنوی میں کوئی قصہ یا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔اس میں پلاٹ کردار، مکالمہ،منظر نگاری، جذبات نگاری، زبان و بیان اور اسلوب جیسے اجزائے ترکیبی پائے جاتے ہیں لیکن میر اثر کی مثنوی میں صرف عشق کی کیفیات کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے جو میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔اس مثنوی میں عشق حقیقی کا بیان خواہ وہ خدا سے ہو یا پیر سے ہو۔اس میں بھی بسا اوقات بیجا مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔اسی طرح عشق مجازی کے سلسلے میں بھی انھوں نے محبوب کے سراپا اور وصل کی کیفیات کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ کسی صوفی تو کیا رند مشرب کے لئے بھی باعث عار ہے۔ان باتوں سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو مثنوی میں بہت سی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں جن کو سلسلہ وار بیان کیا جائے گا۔

اس مثنوی کی سبب تخلیق یہ ہے کہ ایک بار خواجہ میر دردؔ نے مثنوی کے انداز کے سو شعر کہے جسے میر اثر نے

سنا تو وہ انھیں بہت پسند آئے ۔ چنانچہ انھوں نے یہ اشعار میر دردؔ سے لے لئے اور اسی طرز پر مزید شعر کہنے کی اجازت بھی حاصل کر لی۔ اجازت ملنے پر انھوں نے شعر کہنے شروع کئے یہاں تک کہ اشعار کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی۔ درد کے ان سو اشعار کے علاوہ میر اثر نے مزید ان کے سو اشعار فارسی اور سو اشعار ہندوی (اردو) کے اس میں شامل کر دیے پہلے سو اشعار کے علاوہ جو انھیں دردؔ سے عنایت ہوئے ان کو چھوڑ کر باقی اشعار یعنی غزلوں کو انھوں نے دردؔ کے نام کی وضاحت کے ساتھ درج کیا ہے۔ ان مذکورہ بالا باتوں کا اظہار اثر نے اپنی مثنوی میں کچھ اس طرح کیا ہے:

ایک دن جو مزاج میں آیا — بہ تفنن کچھ ایک فرمایا
کہے سو شعر مثنوی کے طور — دفعتاً دم میں بے تامل وغور
پھر اسی وقت کہہ کے دور کئے — یاد رکھ کر وو ہیں میں مانگ لئے
یہی اشعار ہیں بنائے کلام — متفرع اوسی پہ ہے یہ تمام
آپ کہہ کر جو دور فرمایا — وہی اس نظم کا ہے سرمایہ
یوں ہزاروں ہی شعر فرمائے — ذکر مذکور میں وہ کب آئے
یہ تو اس وقت مجھ کو یاد رہے — کہ اجازت سے اوس پہ اور کہے
بسکہ یہ سو غلام ہی کو دیے — نام حضرت جتا جدا نہ کئے
بے جتائے یہ سو ملائے ہیں — وہ جو دو سو ہیں وہ جتائے ہیں

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ اس مثنوی میں کوئی واقعہ یا قصہ بیان نہیں ہوا ہے اس کے باوجود بھی یہ مثنوی کی خصوصیات کی حامل ہے مثنوی میں کن باتوں کا ذکر ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اثر کہتے ہیں:

ہیں گی سودائیوں کی حالاتیں — شورشِ عشق کی خرافاتیں

یعنی اس مثنوی میں سودائیوں کی حالات اور عشق کے معاملات بیان ہوئے ہیں۔ اس کے تحت انھوں مسئلہ عشق پر بھر پور روشنی ڈالی ہے اور اس ضمن میں انھوں نے عشق حقیقی و عشق مجازی، عاشق و معشوق کی مختلف کیفیات کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک طرف وہ عشق مجازی کو عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں وہیں دوسری طرف اس آفت سے بچنے کی دعا بھی کرتے ہیں۔ وہ عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ سمجھتے ہیں لیکن عشق حقیقی کو ہی اپنی منزل جانتے ہیں۔ اس مثنوی میں عشق مجازی میں مبتلا شخص کے حالات بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس میں مبتلا ہونے سے پرہیز کریں اور صرف عشق حقیقی کی طرف متوجہ ہوں اور یہ کام کوئی انسان تنہا نہیں کر سکتا کیوں کہ نفس کو بغیر کسی استاد یا پیر کے شکست دینا آسان نہیں۔ انھوں نے عشق مجازی کی قباحت کچھ اس طرح بیان کی ہے:

عشق صوری بڑی ملامت ہے　　حاصل اس سے یہی ندامت ہے
کہتے ہیں اس کو ضلال مبین　　نفع دنیا ہے کچھ نہ حاصل دین

پھر وہ عشق مجازی سے بچنے کی دعا کرتے ہیں:

ہو نہ یارب کسو کا دل بے تاب　　نہیں دنیا میں اور ایسا عذاب

اثر کی نظر میں عشق مجازی سے بچنا اور عشق حقیقی کی منزلیں طے کرنا ہی اصل مقصد جس میں رہنما پیر ہوسکتا ہے:

ساری دنیا کو خوب دیکھا آہ　　ہے محبت، محبت اللہ
جس سے قائم ہے آسمان وزمیں　　جس سے آوے دلوں میں صدق ویقیں
واقعیٔ عشق، پیر کا ہے عشق　　مرشد دستگیر کا ہے عشق

اثر نے اس مثنوی میں مجاز سے لے کر عشق حقیقی تک پہنچنے کے تمام مراحل کا ذکر کیا ہے اور یہی ان کی منزل مقصود بھی ہے لیکن اس کے لئے عشق مجازی کے خاردار جنگل سے گزرنا ہی ہوگا کیونکہ حقیقت تک جانے یہی راستہ ہے لیکن ایک عاشق صادق اس جنگل سے اپنے دامن کو بچا کے نکل جاتا ہے اور پھر اسے عشق حقیقی کے ناپید کنار سمندر میں غوطہ زن ہونے کی راہ مل جاتی ہے۔ اثر نے عشق مجازی کو بیان کرنے میں جو انداز اختیار کیا ہے اس سے کسی نااہل کو یہ خدشہ ہوسکتا تھا کہ کہیں اثر کا مقصد اس بیان سے لطف اندوزی اور لذت کشی تو نہیں اس لئے انھوں نے مثنوی کی تمہید میں اس بات کی طرف واضح انداز میں اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

الغرض آ گیا تھا ذکر مجاز　　جس پہ کھولا ہے اس کا راز و نیاز
عشق صوری کے اس میں ہیں حالات　　اور اس راہ کی ہیں کیفیات
حال ہے مبتلائے رسوا کا　　وصف ہے یار کے سراپا کا
پر کسو کی نہیں ہے شبیہ ومثال　　ہے یہ تصویر از قبیل خیال
پہلے عاشق کا ہے خراب احوال　　پھر بہ تقریب وصف حسن و جمال
بات ہے ایک جس کا سر نہ پانو　　شخص کوئی نہیں ہے جولوں نانو

اثر نے اس مثنوی کی تمہید میں اپنے کلام کی عریانی بلکہ فحش بیانی کا کئی طرح دفاع کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے اس بیان کی کسی نے تائید نہیں کی ہے بلکہ تمام ناقدین نے اسے سطحی قرار دیا ہے۔ اثر نے اپنی مثنوی کی ابتدا میں اس کی غرض غایت پر روشنی ڈالنے کے بعد عشق و عاشقی، عاشق ومعشوق، ہجر و وصال کو بیان کیا ہے پھر مرد وعورت کی نفسیات پر اپنی رائے پیش کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے معشوق کو اس کے ظلم وستم اور اس کے ناز ونخرے کی طرف توجہ دلا کر اسے عاشق پر لطف وعنایات کرنے کی تلقین کی ہے اور آخر میں انھوں نے اس سلسلے کو

محبوب کے سراپا کے ایسی عکاسی پر ختم کیا ہے جس سے اس کے جسم کا ایک ایک عضو واضح ہو جاتا ہے۔لیکن اس کے بعد انھیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ حد سے تجاوز کر چکے ہیں چنانچہ وہ ان تمام امور سے توبہ کر کے ایک بار پھر محبوب حقیقی سے لو لگانے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ان بیانات کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد بعض لوگوں نے یہ گمان ظاہر کیا ہے یہ میر اثر پر گزرے ہوئے احوال ہیں جو انھوں نے آپ بیتی کی شکل میں بیان کئے ہیں۔جب کہ میر اثر اس سے انکار کرتے رہے ہیں اور انھوں نے اس مثنوی کا نام ہی 'خواب و خیال' رکھا ہے تا کہ کوئی اسے حقیقت نہ سمجھ لے۔

اثر نے اپنی اس مثنوی میں اپنی اور درؔد کی فارسی اور اردو غزلوں کو بہت منظّم انداز میں پیش کیا ہے جس سے مثنوی کا ربط ہر حال میں برقرار رہتا ہے۔ان غزلوں سے یہ فائدہ بھی ہوا ہے کہ پوری مثنوی پر ایک تغزل کی فضا قائم ہوگئی ہے۔جس نے مثنوی کے حسن کو دو بالا کر دیا ہے۔اثر نے اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے ان کی مثنوی محض لذت نفس اور شہوانیت کا شکار نہ بن اس لئے وہ بار بار مناجات،تصوف اور بے ثباتی عالم کے تعلق سے اشعار بھی پیش کرتے رہتے ہیں تا کہ تزکیہ نفس کا مقصد اوجھل نہ ہو جائے۔

اس مثنوی کے زبان و بیان میں جو سلاست و روانی ہے اور اس کی سادگی میں جو پرکاری ہے وہ بڑی مشق و ریاضت سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔نیز سہل ممتنع،روزمرہ اور محاورات،تشبیہیں اور استعارے،سبک ہندی کے الفاظ کا فنکارنہ استعمال جس چابکدستی سے کیا گیا ہے وہ لائق تحسین ہے بلکہ یہ کہنا انسب ہوگا کہ زبان و بیان کے معاملے میں اس درجے کی مثنویاں اردو میں شاید ایک یا دو ہو سکتی ہیں۔

4.4.3 خلاصہ

خواجہ میر اثر کا اصل نام محمد میر ہے اثؔر ان کا تخلص ہے۔وہ خاندان کے اعتبار سے نجیب الطرفین سادات ہیں۔والد کی طرف سے ان کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے اور والدہ کی جانب سے حضرت سید عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ان کا خاندان بخارا سے ہندوستان اورنگ زیب کے زمانہ حکومت میں آیا۔خواجہ فتح اللہ کے بیٹے نواب ظفر اللہ خاں ہیں جو میر ناصر عندلیب کے والد اور میر درد اور میر اثر کے دادا ہیں۔میر اثر کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب شاعر اور ادیب تھے۔انھوں نے شاہ سعد اللہ گلشن سے شعر و ادب،موسیقی اور روحانیت میں فیض حاصل کیا تھا۔خواجہ ناصر عندلیب کی دوسری بیوی سے تین بیٹے تولد ہوئے۔خواجہ میر درؔد،سید میر محمد اور خواجہ محمد میر اثؔر۔خواجہ میر اثر کی پیدائش ۱۱۴۸ھ میں ہوئی۔

میر اثؔر کی تعلیم و تربیت خواجہ میر درد کے زیر سایہ ہوئی علاوہ ازیں انھوں دہلی کے دوسرے علماء سے بھی علم حاصل کیا۔وہ تصوف،موسیقی اور ریاضی میں ماہر تھے۔انھوں نے ریاضی کا علم اس دور کے معروف ریاضی داں خواجہ احمد دہلوی سے سیکھا۔شاعری میں انھوں خواجہ میر درؔد سے اصلاح لی ان کی پوری شاعری پر میر درد کی شاعری کا

گمان ہوتا ہے۔میر اثر کے والد میر ناصر کا انتقال ۱۱۷۲ھ میں ہوا۔اس کے بعد ان کے جانشین وخلیفہ میر درد ہوئے ۔میر اثر خواجہ میر درد سے بیعت ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔انھوں نے درد کے علمی و روحانی کام کو خوب فروغ دیا۔

خواجہ میر اثر کی شادی ۱۱۶۲ھ میں ہوئی جس سے ان کے یہاں ایک بیٹی ہوئی جس کا نام بیگم جان تھا۔ ان کی شادی نواب سید اسد اللہ خاں بن نواب سید جعفر علی خاں سے ہوئی تھی۔

میر اثر کا انتقال ۱۲۰۹ھ میں ہوا اور انھیں ان کے بھائی خواجہ میر درد کے بغل میں دفن کیا گیا۔

خواجہ میر آثر خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔انھوں نے شاعری میں میر درد سے اصلاح لی اور ان ہی کی مرید و جانشین ہوئے۔میر اثر نے اردو میں تین ادبی کارنامے یادگار چھوڑے ہیں جن کے اسماء یہ ہیں: 'دیوان اثر' (اردو) مثنوی 'بیان واقع' اور 'مثنوی خواب وخیال'۔میر اثر کے فارسی دیوان کے ہونے کی بھی اطلاع ملتی ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی قلمی نسخہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔اس لئے اس کے تعلق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا اس لئے اب تک یہی بات ثابت شدہ ہے کہ میر اثر کی تین تصنیفات ہیں جن میں سے دو موجود ہیں اور تیسری کے چند کے اقتباسات کے علاوہ اس کا کوئی مکمل نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔

مثنوی خواب وخیال خواجہ میر آثر کا شاہکار ہے۔ان کی یہ مثنوی عرصۂ دراز تک پردۂ خفا میں رہی۔مولانا حالی نے اس مثنوی کا تذکرہ اپنے مقدمے میں کیا ہے لیکن یہ مثنوی ان کی نظروں سے بھی نہیں گزری تھی۔حالی کی بات پر تنقید کرتے ہوئے علامہ شبلی نے مرزا شوق کا دفاع کیا تھا مگر مثنوی خواب خیال ان کے بھی پیش نگاہ نہیں تھی ۔البتہ اس مباحثے سے یہ فائدہ ہوا کہ لوگ ان کے دیوان اور ان کی مثنوی کی تلاش وجستجو میں مشغول ہو گئے۔مثنوی کو سب سے پہلے دستیاب کرنے اور اس کو شائع کرنے کا فریضہ مولوی عبدالحق نے سرانجام دیا۔انھوں نے ۱۹۲۶ء میں انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کے زیر اہتمام اسے ترتیب دے کر چھاپا۔

میر اثر کی یہ مثنوی روایتی انداز کی مثنوی سے بالکل مختلف ہے۔عموماً مثنوی میں کوئی قصہ یا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔اس میں پلاٹ کردار، مکالمہ، منظر نگاری، جذبات نگاری، زبان و بیان اور اسلوب جیسے اجزائے ترکیبی پائے جاتے ہیں لیکن میر اثر کی مثنوی میں صرف عشق کی کیفیات کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے جو میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔اس مثنوی میں عشق حقیقی کا بیان خواہ وہ خدا سے ہو یا پیر سے ہو۔اس میں بھی بسا اوقات بیجا مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔اسی طرح عشق مجازی کے سلسلے میں بھی انھوں نے محبوب کے سراپا اور وصل کی کیفیات کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ کسی صوفی تو کیا رند مشرب کے لئے بھی باعث عار ہے۔ان باتوں سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو مثنوی میں بہت سی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

اثر نے اس مثنوی کی تمہید میں اپنے کلام کی عریانی بلکہ فحش بیانی کا کئی طرح دفاع کیا ہے۔لیکن اس کے

باوجودان کے بیان کی کسی نے تائید نہیں کی ہے بلکہ تمام ناقدین نے اسے سطحی قرار دیا ہے۔اثر نے اپنی مثنوی کی ابتدا میں اس کی عرض غایت پر روشنی ڈالنے کے بعد عشق و عاشقی، عاشق و معشوق، ہجر و وصال کو بیان کیا ہے پھر مرد و عورت کی نفسیات پر اپنی رائے پیش کی ہے۔اس کے بعد انھوں نے معشوق کو اس کے ظلم و ستم اور اس کے ناز و نخرے کی طرف توجہ دلا کر اسے عاشق پر لطف و عنایات کرنے کی تلقین کی ہے اور آخر میں انھوں نے اس سلسلے کو محبوب کے سراپا کے ایسی عکاسی پر ختم کیا ہے جس کے اس کے جسم کا ایک ایک عضو واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد انھیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ حد سے تجاوز کر چکے چنانچہ وہ ان تمام امور سے توبہ کر کے ایک بار پھر محبوب حقیقی سے لو لگانے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ان بیانات کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد بعض لوگوں نے یہ گمان ظاہر کیا ہے یہ میر اثر پر گزرے ہوئے احوال ہیں جو انھوں نے آپ بیتی کی شکل میں بیان کئے ہیں۔جب کہ میر اثر اس سے انکار کرتے رہے ہیں اور انھوں نے اس مثنوی کا نام ہی 'خواب و خیال' رکھا ہے تا کہ کوئی اسے حقیقت نہ سمجھ لے۔

اثر نے اپنی اس مثنوی میں اپنی اور دردؔ کی فارسی اور اردو غزلوں کو بہت منظّم انداز میں پیش کیا ہے جس سے مثنوی کا ربط ہر حال میں برقرار رہتا ہے۔ان غزلوں سے یہ فائدہ بھی ہوا ہے کہ پوری مثنوی پر ایک تغزل کی فضا قائم ہوگئی ہے۔جس نے مثنوی کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔اس مثنوی کے زبان و بیان میں جو سلاست و روانی ہے اور اس کی سادگی میں جو پرکاری ہے وہ بڑی مشق و ریاضت سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔نیز سہل ممتنع، روزمرہ اور محاورات، تشبیہیں اور استعارے، سبک ہندی کے الفاظ کا فنکارنہ استعمال جس چابکدستی سے کیا گیا ہے وہ لائق تحسین ہے بلکہ یہ کہنا انسب ہوگا کہ زبان و بیان کے معاملے میں اس درجے کی مثنویاں اردو میں شاید ایک یا دو ہو سکتی ہیں۔

4.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کے مطالعے سے آپ نے

میر اثر کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کی۔

میر اثر کے ادبی کارناموں سے آشنائی حاصل کی۔

میر اثر کی مثنوی 'خواب و خیال' کا تجزیہ کیا۔

4.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1. میر اثر کے سوانحی کوائف اختصار کے ساتھ بیان کریں؟
2. میر اثر کی تمام تصانیف کے نام تحریر کریں؟
3. میر اثر کے اردو دیوان پر ایک مختصر نوٹ لکھیں؟

4. میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' پر مختصر نوٹ لکھیں؟

5. میر اثر کے والد اور ان کے بڑے بھائی کا نام تخلص کے ساتھ لکھیں؟

4.6 سوالات کے جوابات

1. خواجہ میر اثر کا اصل نام محمد میر ہے آثر ان کا تخلص ہے۔ وہ خاندان کے اعتبار سے نجیب الطرفین سادات ہیں۔ والد کی طرف سے ان کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے اور والدہ کی جانب سے حضرت سید عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ ان کا خاندان بخارا سے ہندوستان اورنگ زیب کے زمانۂ حکومت میں آیا۔ خواجہ فتح اللہ کے بیٹے نواب ظفر اللہ خاں ہیں جو میر ناصر عندلیب کے والد اور میر درد اور میر اثر کے دادا ہیں۔ میر اثر کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے شاہ سعد اللہ گلشن سے شعر وادب، موسیقی اور روحانیت میں فیض حاصل کیا تھا۔ خواجہ ناصر عندلیب کی دوسری بیوی سے تین بیٹے تولد ہوئے۔ خواجہ میر درد، سید میر محمد اور خواجہ محمد میر آثر۔ خواجہ میر اثر کی پیدائش ۱۱۴۸ھ میں ہوئی۔

میر آثر کی تعلیم وتربیت خواجہ میر درد کے زیر سایہ ہوئی علاوہ ازیں انھوں دہلی کے دوسرے علماء سے بھی علم حاصل کیا۔ وہ تصوف، موسیقی اور ریاضی میں ماہر تھے۔ انھوں نے ریاضی کا علم اس دور کے معروف ریاضی داں خواجہ احمد دہلوی سے سیکھا۔ شاعری میں انھوں خواجہ میر درد سے اصلاح لی ان کی پوری شاعری پر میر درد کی شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ میر اثر کے والد میر ناصر کا انتقال ۱۱۷۲ھ میں ہوا۔ اس کے بعد ان کے جانشین وخلیفہ میر درد ہوئے۔ میر اثر خواجہ میر درد سے بیعت ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ انھوں نے درد کے علمی و روحانی کام کو خوب فروغ دیا۔

خواجہ میر اثر کی شادی ۱۱۶۲ھ میں ہوئی جس سے ان کے یہاں ایک بیٹی ہوئی جس کا نام بیگم جان تھا۔ ان کی شادی نواب سید اسد اللہ خاں بن نواب سید جعفر علی خاں سے ہوئی تھی۔

میر اثر کا انتقال ۱۲۰۹ھ میں ہوا اور انھیں ان کے بھائی خواجہ میر درد کے بغل میں دفن کیا گیا۔

2. میر اثر نے اردو میں تین ادبی کارنامے یادگار چھوڑے ہیں جن کے اسمائیہ ہیں: 'دیوان اثر' (اردو) مثنوی 'بیان واقع' (فارسی) اور 'مثنوی خواب وخیال'۔

3. خواجہ میر اثر کا دیوان بھی ان کے برادے کلاں خواجہ میر درد ہی کی طرح مختصر اور بہت ہی جامع ہے۔ جس طرح میر درد کا کلام حشو زوائد سے پاک ہے اسی طرح میر اثر کا کلام میں بھی غیر ضروری چیزیں نہیں پائی جاتی ہیں۔ وہ پوری طرح سے پاک وصاف اور گوہر آبدار کے مثل معلوم ہوتا ہے۔ جو زبان کی شیرینی، اسلوب کی سادگی، مضمون کی بلندی اور روزمرہ اور آسان زبان وبیان کے باعث سلک گوہر بن گیا ہے۔

میر اثر کے دیوان میں تین طرح کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ اپنے بڑے بھائی خواجہ میر درد

کا مکمل تتبع کرتے ہیں جس سے ان کی شاعری میں بھی وہی خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں جو میر درد کا اختصاص ہیں۔ ان کے کلام کی دوسری خصوصیت عاشقانہ مضامین کی جیتی جاگتی اور سچی تصویر کشی ہے۔ان کے اشعار کی تیسری خصوصیت صوفیانہ مضامین کا بیان ہے۔

4. مثنوی خواب و خیال خواجہ میر اثؔر کا شاہکار ہے۔ان کی یہ مثنوی عرصۂ دراز تک پردۂ خفا میں رہی ۔مولانا حالی نے اس مثنوی کا تذکرہ اپنے مقدمے میں کیا ہے لیکن یہ مثنوی ان کی نظروں سے بھی نہیں گزری تھی ۔حالی کی بات پر تنقید کرتے ہوئے علامہ شبلی نے مرزا شوق کا دفاع کیا تھا مگر مثنوی خواب خیال ان کے بھی پیش نگاہ نہیں تھی۔البتہ اس مباحثے سے یہ فائدہ ہوا کہ لوگ ان کے دیوان اور ان کی مثنوی کی تلاش وجستجو میں مشغول ہوگئے ۔مثنوی کو سب سے پہلے دستیاب کرنے اور اس کو شائع کرنے کا فریضہ مولوی عبد الحق نے سرانجام دیا۔انھوں نے ۱۹۲۶ء میں انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کے زیر اہتمام اسے ترتیب دے کر چھاپا۔

میر اثر کی یہ مثنوی روایتی انداز کی مثنوی سے بالکل مختلف ہے۔عموماً مثنوی میں کوئی قصہ یا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔اس میں پلاٹ کردار، مکالمہ، منظر نگاری، جذبات نگاری، زبان و بیان اور اسلوب جیسے اجزائے ترکیبی پائے جاتے ہیں لیکن میر اثر کی مثنوی میں صرف عشق کی کیفیات کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے جو میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔اس مثنوی میں عشق حقیقی کا بیان خواہ وہ خدا سے ہو یا پیر سے ہو۔اس میں بھی بسا اوقات بیجا مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔اسی طرح عشق مجازی کے سلسلے میں بھی انھوں نے محبوب کے سراپا اور وصل کی کیفیات کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ کسی صوفی تو کیا رند مشرب کے لئے بھی باعث عار ہے۔ان باتوں سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو مثنوی میں بہت سی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

اثر نے اس مثنوی کی تمہید میں اپنے کلام کی عریانی بلکہ فحش بیانی کا کئی طرح دفاع کیا ہے۔لیکن اس کے باوجود ان کے بیان کی کسی نے تائید نہیں کی ہے بلکہ تمام ناقدین نے اسے سطحی قرار دیا ہے۔اثر نے اپنی مثنوی کی ابتدا میں اس کی غرض غایت پر روشنی ڈالنے کے بعد عشق و عاشقی، عاشق و معشوق، ہجر و وصال کو بیان کیا ہے پھر مرد و عورت کی نفسیات پر اپنی رائے پیش کی ہے۔اس کے بعد انھوں نے معشوق کو اس کے ظلم و ستم اور اس کے ناز و نخرے کی طرف توجہ دلا کر اسے عاشق پر لطف و عنایات کرنے کی تلقین کی ہے اور آخر میں انھوں نے اس سلسلے کو محبوب کے سراپا کے ایسی عکاسی پر ختم کیا ہے جس کے اس کے جسم کا ایک ایک عضو واضح ہو جاتا ہے۔لیکن اس کے بعد انھیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ حد سے تجاوز کر چکے چنانچہ وہ ان تمام امور سے توبہ کر کے ایک بار پھر محبوب حقیقی سے لو لگانے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ان بیانات کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد بعض لوگوں نے یہ گمان ظاہر کیا ہے یہ میر اثر پر گزرے ہوئے احوال ہیں جو انھوں نے آپ بیتی کی شکل میں بیان کئے ہیں۔جب کہ میر اثر اس سے انکار کرتے رہے ہیں اور انھوں نے اس مثنوی کا نام ہی 'خواب و خیال' رکھا ہے تا کہ کوئی اسے

حقیقت نہ سمجھ لے۔

اثر نے اپنی اس مثنوی میں اپنی اور دردؔ کی فارسی اور اردو غزلوں کو بہت منظّم انداز میں پیش کیا ہے جس سے مثنوی کا ربط ہر حال میں برقرار رہتا ہے۔ان غزلوں سے یہ فائدہ بھی ہوا ہے کہ پوری مثنوی پر ایک تغزل کی فضا قائم ہوگئی ہے۔جس نے مثنوی کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔اس مثنوی کے زبان و بیان میں جو سلاست و روانی ہے اور اس کی سادگی میں جو پرکاری ہے وہ بڑی مشق و ریاضت سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔نیز سہل ممتنع، روزمرہ اور محاورات، تشبیہیں اور استعارے، سبک ہندی کے الفاظ کا فنکارنہ استعمال جس چابکدستی سے کیا گیا ہے وہ لائق تحسین ہے بلکہ یہ کہنا انسب ہوگا کہ زبان و بیان کے معاملے میں اس درجے کی مثنویاں اردو میں شاید ایک یا دو ہو سکتی ہیں۔

5. میر اثر کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر تھا اور وہ عندلیبؔ تخلص کرتے تھے۔میر اثر کے بڑے بھائی کا نام خواجہ میر تھا اور ان کا تخلص دردؔ تھا۔

۷۔۴ کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
نجیب الطرفین	جس کے ماں اور باپ دونوں اچھے حسب ونسب کے ہوں
ریاضی	عدد و مساحت کا علم جس میں حساب، علم الحساب، نجوم جبر و مقابلہ، جر اثقال اور ہندسہ وغیرہ ہوتے ہیں۔
حشو	بے کار، فضول
زوائد	غیر ضروری، زیادہ، بڑھا ہوا
گوہر آبدار	چمک دار موتی
ژولیدہ	الجھا ہوا
گنجلک	گرہ، گانٹھ، الجھاؤ
سہل ممتنع	ایسا شعر جو دیکھنے میں آسان لگے لیکن ویسا کہنا مشکل ہو
معمولات	روزآنہ کے کام
پردۂ خفا	چھپا ہوا، پوشیدہ
بے تامل	بے فکر، ذہن پر زور ڈالے بغیر
متفرّع	شاخ کی طرح کسی چیز سے نکلنا، شاخ
سودائی	مجنوں، بے وقوف

شہوانیت	نفسیات،شہوت پرستی، بدکاری کی خواہش
لذت اندوزی	مزہ لینا،لطف حاصل کرنا
انسب	بہت بہتر، زیادہ مناسب

4.8 کتب برائے مطالعہ

1. دیوان اثر	ڈاکٹر کامل قریشی
2. خواب وخیال	مرتبہ: مولوی عبدالحق
3. اردو مثنویاں شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین
4. جدید اردو مثنوی فن اور فکری ابعاد	ظفر انصاری ظفر
5. اردو مثنوی کا ارتقا	عبدالقادر سروری

اکائی ۵۔ میر حسن: حیات اور ادبی کارنامے اور سحر البیان کا خصوصی مطالعہ

ساخت

1.5 اغراض و مقاصد

5.2 تمہید

3.5 میر حسن: حیات، ادبی کارنامے اور سحر البیان کا خصوصی مطالعہ

5.3.1 میر حسن: سوانحی کوائف

5.3.2 میر حسن کے ادبی کارنامے

5.3.3 سحر البیان کا خصوصی مطالعہ

5.4.3 خلاصہ

5.4 آپ نے کیا سیکھا؟

5.5 اپنا امتحان خود لیجئے

5.6 سوالات کے جوابات

5.7 کلیدی الفاظ

5.8 کتب برائے مطالعہ

5.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ

میر حسن کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کریں گے۔

میر حسن کے ادبی کارناموں سے متعارف ہوں گے۔

میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا جائزہ لیں گے۔

5.2 تمہید

طلبائے گرامی! گزشتہ اکائی میں آپ میر اثر کے سوانحی کوائف اور ادبی خدمات سے واقف ہوئے ہیں۔ اس میں آپ نے میر اثر کی حیات ان کی تصنیفات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور آخر میں آپ نے ان کی مثنوی 'خواب و خیال' کا تجزیاتی مطالعہ کیا ۔اب اس اکائی میں آپ شمالی ہند کے معروف مثنوی نگار میر حسن کے سوانحی کوائف، ان

کی ادبی خدمات اور آخر میں ان کی مثنوی 'سحر البیان' سے آگہی حاصل کریں گے۔

5.3 میر حسن: حیات، ادبی کارنامے اور سحر البیان کا خصوصی مطالعہ

5.3.1 میر حسن: سوانحی کوائف

میر حسن دہلی کے رہنے والے تھے۔ان کے جدامجد میر امامی ہروی موسوی ہرات سے دہلی شاہجہاں کے عہد حکومت میں آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ میر امامی صاحب علم تھے اس لئے وہ جلدی ہی بادشاہ کے قریب ہو گئے اور انھیں سہ ہزاری کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔اسی علمی اور معاشی طور پر مستحکم گھرانے میں میر حسن کے والد میر غلام حسین ضاحکؔ ۱۷۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ وہ فارسی اور اردو زبان میں شاعر تھے۔انھیں ہجو گوئی میں زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ میر ضاحک کے گھر ۴۲۔۱۷۴۱ء میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام میر حسن رکھا گیا۔ رواج زمانہ کے مطابق ان کی بہترین تعلیم و تربیت ہوئی۔انھیں بچپن سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا چنانچہ ان کے والد نے شاعری کی اصلاح کے لئے انھیں خواجہ میر درد کے حوالے کیا۔ دردؔ کی صحبت اور ان کی تعلیم و تربیت سے میر حسن کے شعری گوئی میں پختگی پیدا ہو گئی۔ دلی میں انتشار اختلال پیدا ہونے کے باعث میر حسن اپنے والد کے ساتھ فیض آباد آ گئے اور یہیں رہنے رہنے لگے۔ یہاں انھیں شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ کے بڑے بیٹے مرزا نوازش نے ملازم رکھ لیا۔ ۱۷۷۰ء میں جن نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اودھ کا پایۂ تخت بنایا تو میر حسن کو فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ آنا پڑا۔لیکن یہاں وہ عتاب شاہی کا شکار ہو گئے اس کا سبب یہ تھا کہ میر حسن پہلے دہلی سے لکھنؤ ہی آئے تھے لیکن اس زمانے میں لکھنؤ محض ایک قصبہ تھا جو میر حسن کو پسند نہیں آیا چنانچہ انھوں نے لکھنؤ کی مذمت میں کچھ شعر رقم کئے جو ان کی مثنوی گلزار ارم میں موجود ہیں:

جب آیا میں دیار لکھنؤ میں — نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں
زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا — کہیں اونچا، کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پر گھر ہوا ہے — کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ ہے
ہر ایک کوچہ یہاں تک تنگ و تر ہے — ہوا کا بھی بہ مشکل واں گزر ہے
لکھوں کیا چوک کی تنگی کا احوال — کُمیت خامہ چل سکتا نہیں چال
سحر سے شام تک رہتا ہے دھڑکا — مبادا، بھیڑیا لے جائے لڑکا

گلزار نسیم کی تصنیف ۱۱۹۲ء تک لکھنؤ دار الخلافہ قرار پا چکا تھا اور بادشاہ بہت زیادہ مال خرچ کر کے لکھنؤ کو دہلی کے مقابل کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ان حالات میں جب نواب آصف الدولہ تک میر حسن کی مثنوی کے اشعار پہنچے تو وہ بہت نالاں ہوئے اور انھوں نے میر حسن کو لکھنؤ سے جلا وطن کر دیا۔ جلا وطنی سے نجات اور بارگاہ نواب میں باریابی کے لئے میر حسن نے مثنوی سحر البیان کی تخلیق کی۔اس بات کا ثبوت خود سحر البیان کے درج ذیل اشعار سے

ملتا ہے:

فلک باگاہا! ملک درگہا | جدا میں جو قدموں سے تیرے رہا
بہ کچھ عقل نے اور نہ تدبیر نے | رکھا مجھ کو محروم، تقدیر نے
پر اب عقل نے میرے کھولے ہیں گوش | دیا ہے مدد نے تری مجھ کو ہوش
سو میں اک کہانی بنا کرنئی | دُرِفکر سے گوندھ لڑیاں کئی
لے آیا ہوں خدمت میں بہر نیاز | یہ امید ہے، پھر کہ ہوں سرفراز
مراعذر تقصیر ہووے قبول | بہ حق علی و بہ آلِ رسول

اس تصنیف کے باوجود میر حسن کو خاطر خواہ انعام واکرام حاصل نہ ہوسکا۔ اس تصنیف کی تکمیل کے دیڑھ دو برس بعد ۲۴/ اکتوبر ۱۷۸۶ء کولکھنؤ میں میر حسن کا انتقال ہوا۔

میر حسن کے نے چار اولادیں یادگار چھوڑیں۔ میر مستحسن خلیقؔ، میر محسن محسنؔ، میر احسن اللہ خلقؔ اور سید احسان اللہ مخلوق چاروںؔ شاعر تھے۔ میر حسن کے بیٹے میر خلیق اور ان کے پوتے میر انیس نے مرثیہ گوئی میں بہت شہرت حاصل کی۔

5.3.2 میر حسن کے ادبی کارنامے

میر حسن اردو کے پر گو شاعر ہیں لیکن ادب میں ان کی شہرت کا مدار مثنوی سحر البیان کی وجہ سے ہے جس سے ان کے دیگر علمی کاموں پر زیادہ توجہ نہیں دی جاسکی ہے۔ جبکہ سحر البیان کے ان کے دوسرے علمی کارنامے بھی لائق اعتنا ہیں۔ میر حسن نے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ فارسی زبان میں تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے شاعری میں ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے جس میں مثنویوں کے علاوہ غزلیں ،قصیدے، ترکیب بند اور مرثیے بھی شامل ہے۔ ان کا کلیات تقریباً نو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ انھوں نے بارہ عدد مثنویاں بھی لکھی ہیں جو حسب ذیل ہیں :۱۔نقل کلاونت ۲۔نقل زن فاحشہ ۳۔ہجو قصائی ۴۔نقل قصائی ۵۔مثنوی شادی آصف الدولہ ۶۔مثنوی رموز العارفین ۷۔مثنوی ہجو حویلی ۸۔مثنوی گلزار ارم ۹۔مثنوی در تہنیت عید ۱۰۔مثنوی در وصف کشف جو ہر ۱۱۔مثنوی در خوان نعمت ۱۲۔مثنوی سحر البیان۔

ان مثنویات میں سے صرف مثنوی رموز العارفین اور گلزار ارم اور سحر البیان ہی قابل ذکر ہیں ورنہ زیادہ تر مثنویاں محض تک بندی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

مثنوی رموز العارفین :اس مثنوی میں انھوں نے حضرت شاہ ابراھیم ادہم بلخی کے واقعات کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس میں ہر دس بارہ اشعار کے بعد کسی صوفی شاعر کے پند و نصائح سے متعلق اشعار کو تضمین کر کے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصوف کے موضوع پر ایک عمدہ مثنوی ہے۔ میر حسن نے اسے اپنی پہلی تصنیف بتایا ہے۔

مثنوی گلزار ارم : میر حسب کی اس مثنوی کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے حالات زندگی اور دہلی سے لکھنؤ کی جانب ہجرت کے احوال درج کئے ہیں جس سے دہلی ،لکھنؤ اور فیض آباد کے احوال اور معاشرے کے ساتھ ساتھ ان شہروں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

علاوہ ازیں میر حسن نے اردو شعرا کا ایک ضخیم تذکرہ 'تذکرہ شعرائے اردو' فارسی زبان میں تحریر کیا ہے۔ اس میں متقدمین شعرا سے لے کر اپنے زمانے تک تقریباً ۳۰۰ شعرا کا مختصر تذکرہ شامل کیا گیا ہے۔انھوں نے اسے ۱۱۹۱ھ سے ۱۱۹۲ھ کے درمیان تحریر کیا تھا۔اس تذکرہ کی ترتیبی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے سید احمد اللہ قادری لکھتے ہیں:

''اس میں خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس زمانے میں لکھا گیا ہے جب شعرائے اردو کا دور سوم ختم ہو چکا تھا اور دور چہارم کی بنیاد پڑ رہی تھی۔دوسری بات یہ ہے کہ میر حسن کی عمر اس وقت تینتالیس سال ہو چکی تھی، اور وہ بہت سے شعرا سے بذات خود واقف تھے۔چنانچہ میر، سودا، درد، اثر، مظہر کو دیکھا تھا۔اس اعتبار سے اس کا بہت بڑا حصہ مصنف کے چشم دید واقعات پر مبنی ہے۔

اس کی تقسیم و ترتیب میں بھی خاص سلیقہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔اس میں مصنف نے دور متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے ردیف وار حروف تہجی کے حساب سے قائم کئے ہیں۔دور متقدمین میں فرخ سیر سے پہلے کے شعرا کا حال اور زبان ریختہ کا دکن میں مروج ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔دور متوسطین فرخ سیر کے آخری عہد سے محمد شاہ کے ابتدائی زمانے پر ختم ہوتا ہے۔دور متاخرین میں اس کے بعد کے شعرا کے حالات مصنف کے عہد تک مرقوم ہیں۔

یہ تذکرہ حقیقت میں ایک غیر معمولی ادبی یادگار ہے۔جس کی بدولت اردو کی ارتقائی تاریخ کے مطالعے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔یہ ۱۳۴۰ھ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی کے ایک مفید مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔''

(میر حسن دہلوی، سید احمد اللہ قادری، مسعود پریس کالی کمان حیدر آباد، ۱۹۳۱ء، ص ص ۸۔۹)

5.3.3 سحر البیان کا خصوصی مطالعہ

اردو زبان میں جس مثنوی کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہے وہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان ہے۔یہ مثنوی اسم با مسمّٰی ہے۔اس کی سحر بیانی کا ہر کوئی قائل ہے اور زمانے نے اس کے بے نظیر ہونے پر محضر نامہ تحریر کیا ہے۔مثنوی سحر البیان متوسط طول کی مثنویوں میں سب سے عمدہ مثنوی سمجھی جاتی ہے اردو میں اس کے مقابل و مماثل اگر کوئی مثنوی ٹھہرتی ہے تو وہ دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' ہے۔سحر البیان کی خوبی کو اجاگر کرتے ہوئے عبدالقادر سروری نے اسے اس صنف کی سب سے بہتر پیداوار قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ متوسط طول کے اعلیٰ پایہ ادبی کارنامہ کی حیثیت سے اردو میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔اگلی اور پچھلی تمام مثنویوں کے مقابلے میں اس کی چند ممتاز خصوصیات ہیں جس کے سبب وہ اس صنف کی سب سے بہتر پیداوار سمجھی جاتی ہے''

(اردو مثنوی کا ارتقا،عبدالقادر سروری،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۲۰۱۰ء،ص ۱۲۰)

سن تصنیف اور وجہ تصنیف

میر حسن نے مثنوی سحر البیان کو ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴۔۸۵ء میں اپنی جلاوطنی کے زمانے میں تحریر کی اور وہ اس مثنوی کے سبب قصور معافی اور انعام واکرام کے طلب گار تھے لیکن بدقسمتی سے انھیں اس سے خاطر خواہ ظاہری فوائد حاصل نہیں ہوئے جس ان کو بہت قلق رہا۔لیکن دوسری طرف حقیقی معنوں میں میر حسن کا نام آج تک اسی مثنوی کے باعث زندہ ہے۔ان کی اس مثنوی کی پہلی اشاعت ان کے دوست میر شیر علی افسوس نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر اپنے دیباچہ کے ساتھ ۱۸۰۳ء میں مرتب کیا اور یہ فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۰۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔اس مثنوی میں تقریباً ڈھائی ہزار اشعار ہیں جس میں ۳۸/حمد باری تعالیٰ کے،۲۶/نعت پاک کے،۱۹/منقبت حضرت علی میں،۱۴اصحاب پاک کے مدح میں کہے گئے ہیں۔

میر حسن نے اپنی مثنوی کو منصوبہ بند پلاٹ کے ذریعہ آگے بڑھایا ہے۔یہ مثنوی صنف مثنوی کی سات مخصوص بحروں میں سے ایک مقبول بحر متقارب مثمن محذوف الآخر جس کا وزن فعولن فعولن فعولن فعول میں لکھی گئی ہے جو بنیادی طور پر رزمیہ کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر میر حسن نے اپنی جدت طبع سے اس رزمیہ وزن کو عشقیہ موضوع میں برتا ہے اور خوب برتا ہے۔مثنوی میں بیان کردہ قصہ میر حسن کا کوئی طبع زاد قصہ نہیں ہے بلکہ انھوں نے مختلف داستانوں کے اجزا سے اس قصے کو تشکیل دیا ہے جو بہت ہی روایتی قسم کا ہے۔اس میں کسی قسم کی جدت و ندرت نہیں پائی جاتی جو قاری کے لئے بہت متاثر کن ہو۔مثنوی میں بیان کردہ قصہ کچھ اس طرح ہے۔کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا جس کی سلطنت نہایت مستحکم و مضبوط تھی اور اسے ہر قسم کا آرام و آسائش حاصل تھی۔اگر اسے کسی بات کا غم تھا تو وہ یہ تھا کہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی جس سے بادشاہ غم زدہ اور مایوس رہتا تھا۔اسی ناامیدی کے باعث اس نے ترک دنیا کا ارادہ کر لیا۔لیکن اس کے وزیر با تدبیر نے اس سے روکا اور مشورہ دیا کہ بادشاہ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ سے امید رکھنی چاہیے چنانچہ اس نے نجومی اور جوتشیوں کو بلا کر بادشاہ کے تعلق سے سوال کیا تو انھوں نے اس کے یہاں بیٹا ہونے کی بشارت دی اور یہ بھی واضح کیا کہ یہ بچہ بارہ سال کی عمر میں کسی آفت کا شکار ہو جائے گا لیکن اس کی جان محفوظ رہے گی۔بس اس پر ایک پری عاشق ہوگی اور اسے اڑا کر لے جائے گی۔چنانچہ نجومیوں کی بات صحیح ثابت ہوئی۔باشاہ کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام بے نظیر رکھا گیا اور ساری سلطنت میں جشن منایا گیا۔اس شہزادے کی پرورش و پرداخت پر خصوصی توجہ دی گئی۔چار سال کی عمر میں اس کا دودھ چھڑوا

کرا سے تعلیم وتربیت کے لئے ماہر اساتذہ کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ رفتہ رفتہ شہزادہ بڑا ہوتا گیا اور بارہ برس کی عمر کو پہنچ گیا۔ ایک دن اسے رات میں بادشاہ نے اپنے محل میں رات بسر کرنے کے لئے بلایا اور محل کے بالا خانے میں شب بسری کا اہتمام کیا گیا اتفاق سے یہ رات بارہ برس میں شامل تھی جس کا کسی کو خیال نہ رہا۔ اس رات ایک پری کا ادھر سے گزر ہوا اس نے ایک بہت ہی خوبرو شہزادے کو سوتا ہوا دیکھا تو وہ اس پر عاشق ہوگئی اور اسے اپنے ساتھ اڑا کر پرستان لے گئی۔ شہزادے کے اچانک غائب ہونے سے پورے محل میں کہرام مچ گیا اور ہر ایک پریشان ومضطرب ہوگیا۔

دوسری جانب ماہ رخ پری شہزادے کو خوش رکھنے کی بھرپور کوشش میں مصروف تھی لیکن شہزادہ کسی طرح سے مانوس نہیں ہوا وہ ہر وقت غمزدہ اور پریشاں رہنے لگا تو پری کو شہزادے کے حال پر رحم آ گیا۔ اس نے شہزادے ہوسیر کے لئے ایک کل کا گھوڑا دے دیا جس پر سوار ہوکر وہ صبح وشام تفریح کے لئے جانے لگا ایک دن اس کا گزر بدر منیر کے محل کے پاس سے ہوا تو شہزادہ اس باغ میں اتر پڑا جہاں بدر منیر بھی اس وقت موجود تھی۔ جب انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ دونوں عشق میں مبتلا ہو گئے۔ پھر تو روز ماہ رخ پری سے چھپ چھپ کر وہ دونوں ملنے لگے لیکن ماہ رخ اس کا علم ہوگیا وہ شہزادے سے بہت خفا ہوئی اور اسے چاہ الم میں قید کر دیا۔ ادھر بدر منیر بے نظیر کی حالت سے بے خبر اس کے ہجر میں پریشان رہنے لگی کہ اچانک ایک دن اسے خواب میں شہزادہ ایک کنویں میں قید دکھائی دیا۔ اس خواب سے وہ بے چین ہواٹھی اس نے یہ بات اپنی سہیلی وزیرزادی نجم النسا کو بتائی تو اسے اپنی سہیلی پر رحم آ گیا اور وہ جوگن بن کر بے نظیر کی تلاش میں نکل پڑی۔ راستے میں اس کی ملاقات فروز شاہ ہوئی جو جنوں کے بادشاہ کا لڑکا تھا۔ فیروز شاہ کو نجم النسا سے محبت ہوگئی لیکن نجم النسا نے اس سے ملنے کے لئے یہ شرط رکھی کہ وہ بے نظیر کو ڈھونڈنے میں اس کی مدد کرے۔ فیروز نے جنوں کی مدد اسے ڈھونڈ نکالا اور اسے اس قید سے باہر نکالا پھر نجم النسا اور فیروز شاہ اسے ساتھ لے کر بدر منیر کے پاس واپس آئے اور بدر منیر اور بے نظیر کی شادی ہوگئی۔ اس کے چند روز بعد نجم النسا اور فیروز شاہ کی بھی شادی ہوگئی۔ بے نظر بدر منیر کے ساتھ اپنے وطن لوٹ آیا اور نجم النسا پرستان چلی گئی۔ یہ ہے مافوق الفطری عناصر سے بنا ہوا پلاٹ جس پر میر حسن نے اپنی مثنوی کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر چہ اس کا پلاٹ بہت اچھا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود میر حسن نے دیگر اجزائے ترکیبی میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔

کردار نگاری

میر حسن نے اس مثنوی میں عمدہ کردار نگاری پیش کی ہے لیکن کردار نگاری میں ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ بے نظیر اور بدر منیر دونوں مرکزی کردار ہیں لیکن وہ اپنے علم مرتبے اور حیثیت کے مطابق فعال نہیں دکھائی پڑتے بلکہ ہر پریشانی اور مصیبت میں دوسروں پر انحصار کرتے ہیں۔ جب کہ اس کے دو ضمنی کردار نجم النسا اور

فیروز شاہ اپنے مرتبے کے مطابق کام کرتے ہیں اور یہ مثنوی کے سب سے فعال اور اہم کردار بن کر سامنے آتے ہیں۔

منظر نگاری

میر حسن نے اس مثنوی میں منظر نگاری کی بہت عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔اسے پڑھ کر تمام مناظر نظر کے سامنے ابھرنے لگتے ہیں اور منظر نگاری میں اسی کو کمال تصور کیا جاتا کہ ان دیکھی چیز دیکھی کے مانند سامنے آجائے ۔میر حسن نے باغ ،جلوس اور دیگر مناظر کو بہت خوبی اور باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔یہاں باغ کی تیاری کے سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ — ہوا رشک سے جس کے لالے کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان — لگے جس میں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار — دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

میر حسن نے اپنی پوری مثنوی میں منظر نگاری کا ایسا سماں باندھا ہے جو بہت ہی زیادہ متاثر کن ہے اور اس میں ہر چیز متحرک اور فعال نظر آتی ہے۔

جذبات نگاری

میر حسن نے اس مثنوی میں جذبات نگاری کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں اور انھوں نے جذبات نگاری کے معاملے میں ماحول اور کرداروں کی سیاسی وسماجی حالات کا بھرپور خیال رکھا ہے۔انھوں نے شعوری طور پر فطرت انسانی کے مختلف پہلوؤں کو بہت کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔جس سے انسانی فکر کے بہت سے باب وا ہوتے ہیں اور قاری کو کرداروں کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ ان کے تکلیف اور غم کو خود بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔میر حسن نے غم و ہجر اور فراق کے ساتھ ساتھ خوشی اور وصال کے موقع پر پیدا ہونے والے جذبات کے بڑے عمدہ مرقعے پیش کئے ہیں۔یہاں بدر منیر کے غم اور فراق کی المناک جذبات نگاری ملاحظہ ہو:

دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی — درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب — لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی — در اشک سے چشم بھرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی — بہانے سے جا جا کے سونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا، نہ وہ بولنا — نہ کھانا، نہ پینا، نہ لب کھولنا

زبان و بیان

میر حسن کی مثنوی کی سب بڑی خاصیت اس کی زبان و بیان ہے۔انھوں نے جس سادگی وصفائی سے

پوری مثنوی کہی ہے وہ اپنے آپ میں بے مثال ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ نگینہ، ہر تشبیہ معقول اور ہر محاورہ حسب حال ہے۔ زبان میں ایسی سلاست و روانی ہے کہ صفحات کے صفحات پڑھتے جائیں لیکن کہیں زبان نہیں اٹکتی، عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کرنے کے بجائے انھوں نے کتنی ہی جگہ ہندی کے سبک الفاظ کو ایسی مہارت کے ساتھ برتا کہ وہ بالکل اردو میں رچ بس گئے ہیں۔ تشبیہ استعارے ایسے سامنے کہ بلا تکلف فہم میں آجائیں۔ اسلوب ایسا جاذب ایسا دلکش اور ایسا دلپذیر کہ آپ پڑھتے جائیں مگر کہیں دل اچاٹ نہ ہو۔ ان کی پوری مثنوی فصاحب و بلاغت کا حسین مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ زبان و بیان کی سلاست، تشبیہ و استعارے اور ہندی الفاظ کا استعمال متفرق اشعار میں ملاحظہ ہو:

مسافر سے کوئی بھی کرتا ہے پیت — مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

کٹی رات حرف و حکایات میں — سحر ہوگئی بات کی بات میں

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں — سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں — گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

حاصل کلام میر حسن کی مثنوی کی یہ چند اہم خصوصیات ہیں جن پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیوں اس مختصر مضمون میں اس کی تمام خوبیوں کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ میر حسن نے زبان اور فن کی سطح پر اس مثنوی میں اپنا خون جگر نچوڑ کر پیش کر دیا ہے اور تمام علمی تاریخی، تہذیبی، جذباتی، زبانی، فنونی معلومات جو ان کے ذہن میں موجود تھی انھوں نے ان سب کو اپنی اس متوسط طول کی مثنوی میں بہت کی اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کی اسی فنی ریاضت کا یہ صلہ ہے کہ اس مثنوی سے ان کا نام ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔

5.4.3 خلاصہ

میر ضاحک کے گھر ۱۷۴۲-۴۳ء میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام میر حسن رکھا گیا۔ رواج زمانہ کے مطابق ان کی بہترین تعلیم و تربیت ہوئی۔ انھیں بچپن سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا چنانچہ ان کے والد نے شاعری کی اصلاح کے لئے انھیں خواجہ میر درد کے حوالے کیا۔ درد کی صحبت اور ان کی تعلیم و تربیت سے میر حسن کے شعری گوئی میں پختگی پیدا ہوگئی۔ دلی میں انتشار اختلال پیدا ہونے کے باعث میر حسن اپنے والد کے ساتھ فیض آباد آگئے اور یہیں رہنے لگے۔ یہاں انھیں شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ کے بڑے بیٹے مرزا نوازش نے ملازم رکھ لیا۔ ۱۷۷۰ء میں جن نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اودھ کا پایۂ تخت بنایا تو میر حسن کو فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ آنا پڑا اور پھر وہ تمام عمر یہیں کے ہو کر رہے۔ اپنی آخری شاہکار تصنیف مثنوی 'سحر البیان' کی تکمیل کے ڈیڑھ دو برس بعد ۲۴/ اکتوبر ۱۷۸۶ء کو لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔

میر حسن اردو کے پر گو شاعر ہیں لیکن ادب میں ان کی شہرت کا مدار مثنوی سحر البیان کی وجہ سے ہے جس

سے ان کے دیگر علمی کاموں پر زیادہ توجہ نہیں دی جاسکی ہے۔ جبکہ سحر البیان کے ان کے دوسرے علمی کارنامے بھی لا ئق اعتنا ہیں۔ میر حسن نے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ فارسی زبان میں تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے شاعری میں ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے جس میں مثنویوں کے علاوہ غزلیں ،قصیدے، ترکیب بند اور مرثیے بھی شامل ہے۔ ان کا کلیات تقریباً نو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ انھوں نے بارہ عدد مثنویاں بھی لکھی ہیں جو حسب ذیل ہیں :۱۔ نقل کلا ونت ۲۔ نقل زن فاحشہ ۳۔ ہجو قصائی ۴۔ نقل قصائی ۵۔ مثنوی شادی آصف الدولہ ۶۔ مثنوی رموز العارفین ۷۔ مثنوی ہجو حویلی ۸۔ مثنوی گلزار ارم ۹۔ مثنوی در تہنیت عید ۱۰۔ مثنوی در وصف کشف جوہر ۱۱۔ مثنوی در خوان نعمت ۱۲۔ مثنوی سحر البیان۔

ان مثنویات میں سے صرف مثنوی رموز العارفین اور گلزار ارم اور سحر البیان ہی قابل ذکر ہیں ورنہ زیادہ تر مثنویاں محض تک بندی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

اردو زبان میں جس مثنوی کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہے وہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان ہے۔ یہ مثنوی اسم با مسمّٰی ہے۔ اس کی سحر بیانی کا ہر کوئی قائل ہے اور زمانے نے اس کے بے نظیر ہونے پر محضر نامہ تحریر کیا ہے۔ مثنوی سحر البیان متوسط طول کی مثنویوں میں سب سے عمدہ مثنوی سمجھی جاتے ہے اردو میں اس کے مقابل و مماثل اگر کوئی مثنوی ٹھہرتی ہے تو وہ دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' ہے۔

میر حسن نے مثنوی سحر البیان کو ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴۔۸۵ء میں اپنی جلاوطنی کے زمانے میں تحریر کی اور وہ اس مثنوی کے سبب قصور معافی اور انعام و اکرام کے طلب گار تھے لیکن بدقسمتی سے انھیں اس سے خاطر خواہ ظاہری فوائد حاصل نہیں ہوئے جس ان کو بہت قلق رہا۔ لیکن دوسری طرف حقیقی معنوں میں میر حسن کا نام آج تک اسی مثنوی کے باعث زندہ ہے۔ ان کی اس مثنوی کی پہلی اشاعت ان کے دوست میر شیر علی افسوس نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر اپنے دیباچہ کے ساتھ ۱۸۰۳ء میں مرتب کیا اور یہ فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۰۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس مثنوی میں تقریباً ڈھائی ہزار اشعار ہیں جس میں ۳۸ر حمد باری تعالیٰ کے ،۲۶ر نعت پاک کے ،۱۹ر منقبت حضرت علی میں ،۱۴ اصحاب پاک کے مدح میں کہے گئے ہیں۔

میر حسن نے زبان اور فن کی سطح پر اس مثنوی میں اپنا خون جگر نچوڑ کر پیش کر دیا ہے اور تمام علمی تاریخی ،تہذیبی ، جذباتی ، زبانی ،فنونی معلومات جو ان کے ذہن میں موجود تھی انھوں نے ان سب کو اپنی اس متوسط طول کی مثنوی میں بہت کی اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کی اسی فنی ریاضت کا یہ صلہ ہے کہ اس مثنوی سے ان کا نام ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔

5.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کے مطالعے سے آپ نے

میر حسن کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کی۔

میر حسن کے ادبی کارناموں سے آشنائی حاصل کی۔

میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' کا خصوصی مطالعہ کیا۔

5.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1. میر حسن کے سوانحی کوائف اختصار کے ساتھ بیان کریں؟
2. میر حسن کی تمام تصانیف کے نام تحریر کریں؟
3. میر حسن کے تذکرہ شعرائے اردو پر ایک مختصر نوٹ لکھیں؟
4. میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' پر مختصر نوٹ لکھیں؟
5. میر حسن کے چاروں بیٹوں کا نام تخلص کے ساتھ لکھیں؟

5.6 سوالات کے جوابات

1. میر ضاحک کے گھر ۴۲۔۱۷۴۱ء میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام میر حسن رکھا گیا۔ رواج زمانہ کے مطابق ان کی بہترین تعلیم و تربیت ہوئی۔ انھیں بچپن سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا چنانچہ ان کے والد نے شاعری کی اصلاح کے لئے انھیں خواجہ میر درد کے حوالے کیا۔ دردؔ کی صحبت اور ان کی تعلیم و تربیت سے میر حسن کے شعری گوئی میں پختگی پیدا ہوگئی۔ دلی میں انتشار اختلال پیدا ہونے کے باعث میر حسن اپنے والد کے ساتھ فیض آباد آ گئے اور یہیں رہنے لگے۔ یہاں انھیں شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ کے بڑے بیٹے مرزا نوازش نے ملازم رکھ لیا۔ ۱۷۷۰ء میں جن نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اودھ کا پایۂ تخت بنایا تو میر حسن کو فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ آنا پڑا اور پھر وہ تمام عمر یہیں کے ہو کر رہے۔ اپنی آخری شاہکار تصنیف مثنوی 'سحر البیان' کی تکمیل کے ڈیڑھ دو برس بعد ۲۴/ اکتوبر ۱۷۸۶ء کو لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔

2. میر حسن نے اپنی ادبی یادگار کے طور پر دو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں پہلا ان کا اردو دیوان جس میں شاعری کی مختلف اصناف پائی جاتی ہیں۔ ان میں بارہ مثنویاں بھی شامل ہے جس میں سے تین مثنویاں بہت معروف اور فنی لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ رموز العارفین، مثنوی گلزار ارم اور مثنوی سحر البیان۔

میر حسن کی دوسری تصنیف 'تذکرہ شعرائے اردو' ہے جو فارسی زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔

3. میر حسن نے اردو شعرا کا ایک ضخیم تذکرہ 'تذکرہ شعرائے اردو' فارسی زبان میں تحریر کیا ہے۔ اس میں متقدمین شعرا سے لے کر اپنے زمانے تک تقریباً ۳۰۰ شعرا کا مختصر تذکرہ شامل کیا گیا ہے۔ انھوں نے اسے ۱۱۹۱ھ سے ۱۱۹۲ھ کے درمیان تحریر کیا تھا۔ اس تذکرہ کی ترتیبی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے سید احمد اللہ قادری لکھتے ہیں:

''اس میں خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس زمانے میں لکھا گیا ہے جب شعرائے اردو کا دور سوم ختم ہو چکا تھا اور دور چہارم کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میر حسن کی عمر اس وقت تینتالیس سال ہو چکی تھی، اور وہ بہت سے شعرا سے بذات خود واقف تھے۔ چنانچہ میر، سودا، درد، اثر، مظہر کو دیکھا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا بہت بڑا حصہ مصنف کے چشم دید واقعات پر مبنی ہے۔

اس کی تقسیم و ترتیب میں بھی خاص سلیقہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے دور متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے ردیف وار حروف تہجی کے حساب سے قائم کئے ہیں۔ دور متقدمین میں فرخ سیر سے پہلے کے شعرا کا حال اور زبان ریختہ کا دکن میں مروج ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ دور متوسطین فرخ سیر کے آخری عہد سے محمد شاہ کے ابتدائی زمانے پر ختم ہوتا ہے۔ دور متاخرین میں اس کے بعد کے شعرا کے حالات مصنف کے عہد تک مرقوم ہیں۔

یہ تذکرہ حقیقت میں ایک غیر معمولی ادبی یادگار ہے۔ جس کی بدولت اردو کی ارتقائی تاریخ کے مطالعے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ یہ ۱۳۴۰ھ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی کے ایک مفید مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔''

(میر حسن دہلوی، سید احمد اللہ قادری، مسعود پریس کالی کمان حیدر آباد، ۱۹۳۱ء، ص ص ۸۔۹)

4. میر حسن نے مثنوی سحر البیان کو ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴۔۸۵ء میں اپنی جلا وطنی کے زمانے میں تحریر کی اور وہ اس مثنوی کے سبب قصور معافی اور انعام و اکرام کے طلب گار تھے لیکن بدقسمتی سے انھیں اس سے خاطر خواہ ظاہری فوائد حاصل نہیں ہوئے جس ان کو بہت قلق رہا۔ لیکن دوسری طرف حقیقی معنوں میں میر حسن کا نام آج تک اسی مثنوی کے باعث زندہ ہے۔ ان کی اس مثنوی کی پہلی اشاعت ان کے دوست میر شیر علی افسوس نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر اپنے دیباچہ کے ساتھ ۱۸۰۳ء میں مرتب کیا اور یہ فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۰۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس مثنوی میں تقریباً ڈھائی ہزار اشعار ہیں جس میں ۳۸ر حمد باری تعالیٰ کے، ۲۶ر نعت پاک کے، ۱۹ر منقبت حضرت علی میں، ۱۴ اصحاب پاک کے مدح میں کہے گئے ہیں۔

میر حسن نے زبان اور فن کی سطح پر اس مثنوی میں اپنا خون جگر نچوڑ کر پیش کر دیا ہے اور تمام علمی تاریخی، تہذیبی، جذباتی، زبانی، فنونی معلومات جو ان کے ذہن میں موجود تھی انھوں نے ان سب کو اپنی اس متوسط طول کی مثنوی میں بہت کی اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کی اسی فنی ریاضت کا یہ صلہ ہے کہ اس مثنوی سے ان کا نام ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔

5. میر حسن کے چاروں بیٹوں کے نام یہ ہیں: ۱۔ میر مستحسن خلیق ۲۔ میر محسن محسن ۳۔ میر احسن اللہ خلق ۴۔ سید احسان اللہ مخلوق

5.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
تولد	پیدائش، پیدا ہونا
مستحکم	مضبوط
اختلال	ابتری، انتشار، بدنظمی
عتاب	غصہ، ناراضگی
دارالخلافہ	دارالحکومت، راجدھانی، وہ شہر جہاں خلیفہ یا بادشاہ رہتا ہو
جلاوطن	شہر بدر، ملک سے نکال دینا
باریاب	رسائی، پیشی،
کلاونت	مغنی، ماہرفن گوّیا، گانے کے علم میں ماہر
ضخیم	موٹا، بھاری
متقدمین	پہلے زمانے کے لوگ
متوسطین	درمانی زمانے کے لوگ
متاخرین	بعد کے زمانے کے لوگ
چشم دید	آنکھوں دیکھا
محضرنامہ	تصدیق نامہ، ایسا کاغذ جس پر معتبر لوگوں کے دستخط ہوں
اسم بامسمی	جیسا نام ویسا کام
ندرت	انوکھا پن
نجومی	ستاروں کی چال دیکھ کر مستقبل بتانے والا
ریاضت	مشق، محنت

5.8 کتب برائے مطالعہ

1. دیوان میرحسن	میرحسن
2. مثنوی سحرالبیان	مرتبہ: ظہیراحمد صدیقی
3. اردو مثنویاں شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین
4. جدید اردو مثنوی فن اور فکری ابعاد	ظفر انصاری ظفر
5. تذکرہ شعرائے اردو	مرتبہ: حبیب الرحمٰن خاں شیروانی

اکائی 6. پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزارِ نسیم کا اجمالی جائزہ

ساخت

6.1 اغراض و مقاصد

6.2 تمہید

6.3 پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کا اجمالی جائزہ

6.3.1 دیا شنکر نسیم: سوانحی کوائف

6.3.2 دیا شنکر کے ادبی کارنامے

6.3.3 گلزار نسیم کا اجمالی جائزہ مطالعہ

6.4.3 خلاصہ

6.4 آپ نے کیا سیکھا؟

6.5 اپنا امتحان خود لیجئے

6.6 سوالات کے جوابات

6.7 کلیدی الفاظ

6.8 کتب برائے مطالعہ

6.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ

دیا شنکر نسیم کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کریں گے۔

دیا شنکر نسیم کے ادبی کارناموں سے متعارف ہوں گے۔

دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کا جائزہ لیں گے۔

6.2 تمہید

طلبائے گرامی! گزشتہ اکائی میں آپ میر حسن کے سوانحی کوائف اور ادبی خدمات سے واقف ہوئے ہیں ۔اس میں آپ نے میر حسن کی حیات ان کی تصنیفات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور آخر میں آپ نے ان کی مثنوی 'سحر البیان' کا خصوصی مطالعہ کیا ۔اب اس اکائی میں آپ شمالی ہند کے معروف مثنوی نگار دیا شنکر نسیم کے سوانحی

کوائف،ان کی ادبی خدمات اور آخر میں ان کی مثنوی 'گلزارنسیم' سے آگہی حاصل کریں گے۔

6.3 پنڈت دیاشنکرنسیم کی مثنوی گلزارنسیم کا اجمالی جائزہ

6.3.1 دیاشنکرنسیم: سوانحی کوائف

پنڈت دیاشنکرنسیم ایک کے معروف مثنوی نگار ہیں۔انھوں کی ایک ہی مکمل یادگار باقی رہی جوان کی وجہ شہرت اور حیاتِ جاودانی کا باعث ہے۔ان کی یہ باقیات الصالحات 'مثنوی گلزارنسیم' ہے جو دبستان لکھنؤ کی سب سے نمائندہ مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔ان کا اصل نام پنڈت دیاشنکر تھا اور نسیم ان کا تخلص ہے۔یہ لکھنؤ کے میں آباد کشمیری برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو گوتر کے حساب سے کول کہلاتا تھا۔ان کے والد کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔نسیم کی پیدائش بہ قول چکبست ۱۸۱۱ء میں میں لکھنؤ میں ہوئی۔نسیم فطری شاعر تھے انھوں نے بیس برس کی عمر تک شاعری کا اچھا مذاق پیدا کر لیا تھا چنانچہ شاعری کی اصلاح کے لئے انھوں نے خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی اختیار کی۔نسیم کی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق ہوئی۔اردو و فارسی زبان میں انہیں کامل دسترس حاصل تھی اور وہ شاہی فوج میں نوکری کرتے تھے۔نسیم کا انتقال رشید حسن خاں کے مطابق ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء کو لکھنؤ میں ہوا۔

6.3.2 دیاشنکر کے ادبی کارنامے

پنڈت دیاشنکرنسیم کل ۳۴/برس کی مختصر عمر پائی اس لئے ان کی ادبی زندگی محض چودہ سال بنتی ہے۔ انھوں نے باقاعدہ شعرگوئی کا آغاز بیس سال کی عمر سے کیا تھا۔ان کا علمی سرمایہ بھی بہت تھوڑا سا ہے جس میں ایک مختصر سا دیوان اور دوسرا ان کی مثنوی 'گلزارِنسیم' ہیں۔

6.3.3 گلزارنسیم کا اجمالی جائزہ مطالعہ

پنڈت دیاشنکرنسیم کی مثنوی گلزارنسیم کی پہلی اشاعت ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں مطبع حسینی لکھنؤ سے ہوئی۔ یہ مثنوی قصہ گل بکاولی سے ماخوذ ہے۔جو عزت اللہ بنگالی نے سب سے پہلے فارسی نثر میں لکھا تھا لیکن یہ قصہ ان کا بھی طبع زاد نہیں بلکہ ہند ایرانی معاشرت میں گردش کرنے والی قصے کی روایت سے اس کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔اس فارسی نثر کے قصے کو گل کرسٹ کی فرمائش پر منشی نہال چند لاہوری نے اردو نثر میں ترجمہ کیا۔اس کا تاریخی نام 'مذہب عشق' رکھا۔نسیم سے قبل ریحان الدین ریحان لکھنوی اسی قصے کو 'خیابان' کے نام سے ایک طویل مثنوی کی صورت میں نظم کر چکے تھے۔اس میں نو ہزار اشعار تھے۔لیکن نسیم نے مذہب عشق کو پیش نظر رکھ کر اس قصے منظوم کیا اور اس فنکاری کے ساتھ پیش کیا کہ یہ قصہ ان کی مثنوی کے ساتھ لازوال حیثیت کا حامل بن گیا۔نسیم نے اپنی اس مثنوی کی تمہید میں اس بات کی وضاحت بھی کر دی ہے یہ ان کا طبع زاد قصہ نہیں ہے۔وہ کہتے ہیں:

ہر چند سنا گیا ہے اس کو　　اردو کی زباں میں سخن گو
وہ نثر ہے، داد نظم دوں میں　　اس مے کو دو آتشہ کر دوں میں

نسیم میں اپنی مثنوی کا آغاز حمد سے کیا اور پھر انھوں نے مناجات کے چند اشعار کہے ہیں جس میں انھوں نے اپنی مثنوی کے مقبول عام ہونے کی دعا کی ہے۔ اس کے بعد اصل قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ مثنوی میں روایتی قسم کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس میں مافوق الفطرت عناصر کا غلبہ ہے لیکن اس کے باوجود نسیم نے اس میں اپنی سحر بیانی سے روح پھونک دی ہے۔ گلزار نسیم لکھنوی زبان و بیان کا مکمل ترین نمونہ گردانا جاتا ہے اس میں اختصار و جامعیت کا جو وصف پایا جاتا ایسا اردو کی کسی دوسری مثنوی میں نہیں ملتا۔

یہ مثنوی لکھنؤ میں جس دور میں تحریر کی گئی اس زمانے میں لکھنؤ میں زبان و بیان کی سطح پر لفظی صناعی کا دور دورہ تھا۔ رجب علی بیگ سرور نے نثر میں فسانۂ عجائب جیسی مسجّع و مقفّیٰ تخلیق پیش کر کے دہلی کی سادہ و سلیس زبان کے برعکس پر تکلّف زبان کی بنیاد رکھ دی تھی جسے دبستان لکھنؤ کے دو استاد شعرا یعنی آتش و ناسخ نے کمال بلندی پر پہنچا دیا تھا اور وہ نہ صرف شاعری کو صناعی کے مماثل قرار دے چکے تھے بلکہ انھوں نے صناعوں کی ایک فوج ظفر موج بھی تیار کر دی تھی۔ آتش صاف طور پر کہہ چکے تھے کہ:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　شاعری بھی کام ہے آتش! مرصّع ساز کا

ایسے ماحول اور ایسے ماہر فن استاد کے زیر سایہ دیا شنکر نسیم نے جب اپنی مثنوی تحریر کی تو انھوں نے بھی زبان و بیان کے باب میں ایک تاریخ رقم کر دی۔

پلاٹ

مثنوی گلزار نسیم کا پلاٹ شروع سے آخر تک بہت مربوط ہے اس قصے کے درمیان میں دو مختصر سی حکایتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ یہ حکایتیں قصہ کے تاثر کو کسی طرح زک نہیں پہنچاتی بلکہ اس کی تکمیل میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ مثنوی کا پلاٹ نہایت مختصر ہے۔ وہ یہ کہ مشرق میں ایک بادشاہ تھا جس کے چار بیٹے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے یہاں پانچواں بیٹا بھی پیدا جس کا نام تاج الملوک رکھا گیا۔ لیکن نجومیوں نے اس کے تعلق سے ایک بہت عجیب پیشین گوئی کی کہ اگر بادشاہ کی نظر اس بچے پر پڑے گی تو اس کی بینائی چلی جائے گی۔ اس پیشین گوئی کے باعث اس بات کی پوری کوشش کی گئی کہ بادشاہ کسی حال میں بھی بچے کو نہ دیکھے مگر تقدیر کو کون ٹال سکتا ایک دن بادشاہ کی نظر بچے پر پڑ ہی گئی جس سے بادشاہ اندھا ہو گیا۔ اس کا یہ علاج تجویز ہوا کہ اگر گل بکاولی کو بادشاہ کی آنکھ پر لگایا جائے تو روشنی لوٹ آئے۔ چنانچہ چاروں شہزادے اس پھول کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں مگر وہ ایک بیسوا کے قیدی بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف تاج الملوک بھی اس گل کی تلاش میں نکلتا ہے اور بہت ہی آزمائش سے گزرنے کے بعد وہ پھول لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی قصے کو مرکز میں رکھ کر مثنوی کا پلاٹ تیار کیا گیا ہے۔

کردار

مثنوی میں نسیم نے کردار نگاری کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں مثنوی دونوں مرکزی کردار تاج الملوک اور بکاولی میں زندگی کی تمام کیفیتیں کا کی بھر پور عکاسی ملتی ہے ۔ یہ دونوں کردار پوری طرح سے متحرک اور فعال نظر آتے ہیں ۔ یہ زندگی میں پیش آنے والی ہر تکلیف وکلفت سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اپنے اندر رکھتے ہیں مثنوی نے ان دونوں کرداروں نے اس جا بجا ثبوت فراہم کیا ہے ۔مثلاً تاج الملوک نے دلبر بیسوا کو اپنی عقلمندی سے شکست دی ۔ دیو کو حلوا کھلا کر رام کیا اور اسے اپنی مہم میں مدد دینے پر راضی کرلیا اور اس کی مدد سے اس نے آخر کا گل بکاولی کو حاصل کرلیا اور وہاں سے کامیاب وکامران لوٹا۔اسی طرح بکاولی میں بھی کسی مرحلے پر کوئی کمزروری نہیں دکھائی پڑتی وہ بھی مثنوی میں بہت کی وفعال نظر آتی ہے ۔تاج الملوک جب اس کا پھول لے کر چلا جاتا تو وہ اپنی کوششوں سے اس کا پتہ چلا لیتی ہے اور کی تلاش میں نکل پڑتی ہے ۔اس کے علاوہ بھی وہ دیگر مواقع پر بھی اپنی ذہانت کا ثبوت پیش کرتی ہے ۔اسی طرح مثنوی کا ایک نسوانی کردار دلبر بیسوا ہے جو اتنی چالاک اور حرافہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو اپنی چالاکی سے شکار بنا لیتی ہے اور آخر میں جب تاج الملوک سے وہ بازی میں اپنے آپ کو بھی ہار جاتی ہے تو اپنی ذہانت سے شادی کی تجویز پیش کر کے پھر آزادی حاصل کر لیتی ہے

منظر نگاری

نسیم نے اپنی مثنوی میں اختصار کے باوجود منظر نگاری کے خوبصورت نمونے پیش کئے ہیں ۔ انھوں نے باغات اور صحرا جیسے فطری مناظر کی منظر کشی میں اپنی شاعری کے جوہر دکھائے ہیں ۔ان کی منظر نگاری میں اختصار اور زبان و بیان کی سطح ہر رعایت لفظی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں ۔ انھوں نے اپنی اس صناعی سے باغ کی بے جان چیزوں کو بھی زندہ کر دیا ہے اور ان کی فطری ہیئت کو منظر نگاری کے لئے بخوبی استعال کیا ہے ۔ بکاولی کے گل کے غائب ہونے کے بعد اس باغ کا جو منظر تھا اس کا نقشہ نسیم نے کچھ یوں پیش کیا ہے:

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کر کہرام	تھی سبزے سے راست مو بر اندام
انگلی لب جو، پہ رکھ کر شمشاد	تھا دم بخود، اس کی سن کے فریاد
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا	جو برگ تھا، ہاتھ مل رہا تھا

نسیم کے یہاں منظر نگاری کے سلسلے میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ عیش ونشاط اور لذت کوشی کے مناظر کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں ۔ پہلا منظر تاج الملوک کا بکاولی کے باغ سے پھول حاصل کرنے کے بعد جب وہ اس کی خواب گاہ میں داخل ہوتا ہے اور اسے سوتا ہوا دیکھ کر اسے گلے لگانے کی خواہش کرتا ہے ۔اسی طرح تاج الملوک اور بکاولی کی پہلی بے حجاب ملاقات کو انھوں نے قدرے تفصیل اور لطف کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ایسے ہی تاج الملوک جب پریوں کو بے حجاب نہاتے ہوئے دیکھتا ہے اور ان کے کپڑے چھپا دیتا ہے اس منظر کو بھی انھوں

بڑے لطف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پہلا منظر ملاحظہ ہو:

بالا دری واں جو سونے کی تھی — سو خواب گاہ بکاولی تھی
گول اس کے ستوں، تھے ساعد حور — چلمن، مژگان چشم مخمور
دکھلاتا تھا وہ مکان جادو — محراب سے در سے چشم و ابرو
پردہ جو حجاب سے اٹھایا — آرام میں اس پری کو پایا
بند اس کی وہ چشم نرگسی تھی — چھاتی کچھ کچھ کھلی تھی

پریوں کے نہانے کا منظر ملاحظہ ہو:

بے ننگ وہ سب نہا رہی تھیں — موجیں باہم اڑا رہی تھیں
سوچا وہ کہ ان کو دیجیے جل — خس پوش کیے وہ جامہ گل
جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں — باہر بہ صد آب و تاب آئیں
پوشاک دھری ہوئی نہ پائی — جانا کہ حریف نے اڑائی
جھک جھک کے بدن چراتی آئیں — رک رک کے قدم بڑھاتی آئیں

ایسی منظر کشی تو ان کے یہاں مل جاتی ہے مگر مناظر قدرت کی منظر کشی کا بیان ان کے یہاں بہت کم پایا جاتا ہے۔ گلزار نسیم میں بہت سے مقامات کا بھی ذکر آیا ہے مگر نسیم نے ان میں سے کسی شہر وغیرہ کی منظر کش کی طرف بالکل دھیان نہیں دیا۔ یہ ان کی منظر نگاری کی کمزوری میں شمار ہوتا ہے۔

جذبات نگاری

گلزار نسیم میں کردار نگاری اور منظر نگاری کے علاوہ جذبات نگاری کے بھی بہت سے نمونے ملتے ہیں لیکن ان میں یہ خرابی ہے کہ جن لوگوں کے جذبات کو بیان کیا جا رہا وہ اپنی حیثیت سے عموماً گرے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کے جذبات لکھنؤ کے متوسط طبقے کے جذبات و احساسات سے آگے بڑھتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ اگر نسیم نے کرداروں کی حیثیت کے مطابق جذبات کی عکاسی کی ہوتی تو وہ جذبات نگاری کے اچھے نمونے پیش کر سکتے تھے۔ اس بنیادی کمزوری کے باوجود بھی انھوں نے کہیں کہیں اچھی جذبات نگاری پیش کرنے کوشش کی ہے جیسے بکاولی کی ماں نے تاج الملوک اور بکاولی کو ساتھ دیکھا تو اس نے اپنے غصے کا اظہار اس انداز میں کیا۔ یہاں اس موقع سے متعلق اشعار دیکھنے سے آپ کو نسیم کی جذبات نگاری کا اندازہ ہو جائے گا:

آ کر جو ہے دیکھتی جمیلہ — روشن تھے چراغ اور فتیلہ
وہ شعلۂ آتشیں لپک کے — بجلی سی گری چمک دمک کے
دونوں کی نہ رہی جان تن میں — کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

شہ زادے پر اس نے مار چنگال　　دریائے طلسم میں دیا ڈال
بیٹی کی طرف کیا نظارہ　　جھلا کے کہا کہ خام پارہ
حرمت میں لگایا داغ تو نے　　لٹوائی باغ بہار تو نے
تھمتا نہیں غصہ تھامنے سے　　چل دور ہو میرے سامنے سے

اسی طرح تاج الملوک جب بکاولی کا پھول لے کر چلا جاتا ہے اور صبح بکاولی اپنا گل نہیں پاتی تو اس وقت اس کے جذبات کی عکاسی ملاحظہ ہو:

منھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی　　پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہَوا ہوا ہے　　کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل!　　جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون　　ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

مکالمہ نگاری

مکالمہ کسی بھی قصے کا اہم جز ہے اس کے بنا کوئی کہانی ارتقا حاصل نہیں کر سکتی اور نہ اس کے بغیر کرداروں کے درمیان پائے جانے والے روابط کا پتہ چل سکتا ہے۔ چنانچہ اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے نسیم نے بھی اپنی مثنوی میں بہترین مکالمہ نگاری پیش کی ہے۔ تاج الملوک اور بکاولی کے درمیان ہونے والا ایک مکالمہ دیکھیں یہ اس موقع پر پیش آیا جب بکاولی نے یہ جان لیا کہ تاج الملوک ہی گل چیں ہے:

بولی وہ پری بہ صد تامل　　کیوں جی! تمہیں لے گئے تھے وہ گل؟
کیا کہتی ہوں میں، ادھر تو دیکھو　　میری طرف ایک نظر تو دیکھو
ہے یا نہیں یہ خطا تمہاری　　فرمایئے کیا سزا تمہاری؟

اس کے جواب میں تاج الملوک کہتا ہے:

کی عرض رضا ہے، جو خوشی ہو　　عاشق کی سزا جو پوچھتی ہو
مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ　　کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ
تلوار سے جو قتل ہو منظور　　ابرو کے اشارے سے کرو چور
زنداں میں جو زندہ بھیجنا ہو　　اپنے دل تنگ میں جگہ دو

زبان و بیان اور اسلوب

مثنوی گلزار نسیم خالصتاً لکھنؤ زبان کی سب سے عمدہ اور کامیاب مثنوی ہے۔ آتش نے جس مرصع سازی کو فروغ دیا تھا نسیم نے اسے بام عروج تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کی مثنوی لکھنوی زبان و

تہذیب کا شاہکار ہے۔انھوں نے زبان و بیان کے تئیں دبستان لکھنؤ کی مکمل پیروی کی ہے جس کا خاصہ الفاظ کو نگینوں کے مانند شاعری میں جڑنے کا رہا ہے اور الفاظ اور رعایت لفظی کا استعمال ،نئی تشبیہ واستعاروں کو تراش و خراش اور ان کو شاعری میں برتنا ہی لکھنؤ کی شاعری کا خاصہ رہا ہے۔ جہاں معانی سے زیادہ الفاظ کی اہمت رہی ہے۔اس رجحان نے جہاں زبان کی سطح پر بہت سی قابل قدر چیزیں پیش کیں وہیں اس کا نقصان یہ ہوا کہ وہاں کی زیادہ تر شاعری معنویت سے عاری محض الفاظ کی جگالی بن کر رہ گئی۔لیکن دیا شنکر نسیم کی یہ مثنوی محض زبان کی سطح پر کامیاب نہیں بلکہ فنی اعتبار سے بھی چند ایک چھوٹی موٹی کمیوں کے ساتھ اردو ادب کی معروف ترین دو مثنویوں میں سے ایک ہے۔نسیم نے مثنوی میں جس زبان کا استعمال کیا ہے اس کے پیچھے دہلی والوں سے اپنی زبان اور اسلوب کو منفرد دکھانا بھی ایک وجہ ہے۔ جو الفاظ کو پوری فنی چابکدستی سے برتے بغیر ممکن نہیں ہے اس لئے نسیم نے اس مثنوی میں رعایت لفظی کا پوری صناعی کے ساتھ بھرپور استعمال کیا ہے۔اگر چہ لفظی صناعی سے مصنوعی پن کے پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے مگر گلزار نسیم اس عیب سے بہت حد تک مبرا ہے۔ یہاں ایک شعر میں رعایت لفظی کی صنعت تجنیس کا استعمال اور شعر کا بے ساختہ پن ملاحظہ ہو:

غولوں سے بھرا تھا جو بیاباں　　پھولوں سے بنا دیا خیاباں

غلوں اور پھولوں، بیاباں اور خیاباں کے درمیاں صفت تجنیس پائی جاتی ہے یعنی یہ ایک ہی قسم کے الفاظ ہیں۔

نسیم نے اپنی مثنوی میں تشبیہات و استعارات کا پورے کمال کے ساتھ مظاہرہ کیا ہے۔انھوں نے تشبیہات کو کم اور استعارات کو خوب برتا ہے۔دو مثالیں پیش خدمت ہیں:

آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر　　فانوس خیال بن گیا گھر

پتلی پر زرگل آزمایا　　سونے کو کسوٹی پر آزمایا

اسی طرح انھوں نے محاورات اور ضرب الامثال کو بھی شاعری میں برتا ہے:

کیا لطف جو غیر پر پردہ کھولے　　جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے

میٹھا رس دیو کو کھلاؤ　　گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو

خلاصہ کلام اس مختصر سے جائزے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی اپنے اختصار اور جامعیت میں بے مثل ہے۔ساتھ ہی اس میں مثنوی کے اجزائے ترکیبی کا لحاظ رکھتے ہوئے پوری مہارت کے ساتھ قصے کو پیش کیا گیا ہے جس سے یہ اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت کی حامل بن گئی ہے۔ یہ مثنوی اپنے زبان و بیان اور اختصار کے لئے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی اور اردو مثنوی کو کوئی تاریخ اس مثنوی کا ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

6.4.3 خلاصہ

پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم اردو ادب کی نمائندہ مثنویوں میں سے ایک ہے اور دبستان لکھنؤ کی یہ پہلی طویل مثنوی ہے۔اس مثنوی کا قصہ عزت اللہ بنگالی کی تحریر کردہ فارسی قصے سے ماخوذ ہے جو گل بکاولی کے قصے کے نام سے معروف ہے۔مثنوی گلزار نسیم میں مثنوی کے فن کو بخوبی برتا گیا ہے اور تمام اجزائے ترکیبی کی بھر پور رعایت کی گئی ہے۔اس بنا پر یہ پلاٹ، کردار، منظر نگاری، مکالمہ نگاری، جذبات نگاری اور زبان و بیان کی گوناں گوں خصوصیت سے مالا مال ہے۔اس میں تشبیہ و استعارہ اور رعایت لفظی کو بہت باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے ۔جس سے یہ مثنوی کے باب میں ایک حسین مرقع بن کر سامنے آئی ہے۔پوری مثنوی تواتر و تناسب کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔گلزار نسیم میں قصے کے در پردہ لکھنؤ کی تہذیب کے عکس نظر آتا ہے جو اس زمانے کے لکھنؤ کے معاشرے کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔گلزار نسیم کی اسی فنی خصوصیات کے باعث اسے اردو ادب کا ایک شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے جس کی اہمیت و معنویت کسی زمانے میں کم نہیں ہوگی۔

6.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کے مطالعے سے آپ نے

پنڈت دیا شنکر نسیم کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کی۔

پنڈت دیا شنکر نسیم کے ادبی کارناموں سے آشنائی حاصل کی۔

پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' کا جائزہ لیا۔

6.5 اپنا امتحان خود لیجئے

۱۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کے سوانحی کوائف اختصار کے ساتھ بیان کریں؟

۲۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی تمام تصانیف کے نام تحریر کریں؟

۳۔ پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' پر مختصر نوٹ لکھیں؟

6.6 سوالات کے جوابات

1. پنڈت دیا شنکر نسیم ایک کے معروف مثنوی نگار ہیں۔انھوں کی ایک ہی مکمل یادگار باقی رہی جو ان کی وجہ شہرت اور حیاتِ جاودانی کا باعث ہے۔ان کی یہ باقیات الصالحات 'مثنوی گلزار نسیم' ہے جو دبستان لکھنؤ کی سب سے نمائندہ مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔ان کا اصل نام پنڈت دیا شنکر تھا اور نسیم ان کا تخلص ہے۔یہ لکھنؤ کے میں آباد کشمیری برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو گوتر کے حساب سے کول کہلاتا تھا۔ان کے والد کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔نسیم کی پیدائش بہ قول چکبست ۱۸۱۱ء میں میں لکھنؤ میں ہوئی۔نسیم فطری شاعر تھے انھوں نے بیس برس

کی عمر تک شاعری کا اچھا مذاق پیدا کر لیا تھا چنانچہ شاعری کی اصلاح کے لئے انھوں نے خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی اختیار کی۔نسیم کی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق ہوئی۔اردو و فارسی زبان میں انہیں کامل دسترس حاصل تھی اور وہ شاہی فوج میں نوکری کرتے تھے۔نسیم کا انتقال رشید حسن خاں کے مطابق ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء کو لکھنؤ میں ہوا۔

2۔(۱) دیوان نسیم (۲) گلزار نسیم

3۔پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کی پہلی اشاعت ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں مطبع حسینی لکھنؤ سے ہوئی۔یہ مثنوی قصہ گل بکاولی سے ماخوذ ہے۔جو عزت اللہ بنگالی نے سب سے پہلے فارسی نثر میں لکھا تھا لیکن یہ قصہ ان کا بھی طبع زاد نہیں بلکہ ہند ایرانی معاشرت میں گردش کرنے والی قصے کی روایت سے اس کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔اس فارسی نثر کے قصے کو گل کرسٹ کی فرمائش پر منشی نہال چند لاہوری نے اردو نثر میں ترجمہ کیا۔اس کا تاریخی نام 'مذہب عشق' رکھا۔نسیم سے قبل ریحان الدین ریحان لکھنوی اسی قصے کو 'خیابان' کے نام سے ایک طویل مثنوی کی صورت میں نظم کر چکے تھے۔اس میں نو ہزار اشعار تھے۔لیکن نسیم نے مذہب عشق کو سامنے رکھ کر اس قصے منظوم کیا اور اس فنکاری کے ساتھ پیش کیا کہ یہ قصہ ان کی مثنوی کے ساتھ لازوال حیثیت کا حامل بن گیا۔

نسیم میں اپنی مثنوی کا آغاز حمد سے کیا اور پھر انھوں نے مناجات کے چند اشعار کہے ہیں جس میں انھوں نے اپنی مثنوی کے مقبول عام ہونے کی دعا کی ہے۔اس کے بعد اصل قصہ شروع ہو جاتا ہے۔مثنوی میں روایتی قسم کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس میں مافوق الفطرت عناصر کا غلبہ ہے لیکن اس کے باوجود نسیم نے اس میں اپنی سحر بیانی سے روح پھونک دی ہے۔گلزار نسیم لکھنؤ زبان و بیان کا مکمل ترین نمونہ گردانا جاتا ہے اس میں اختصار و جامعیت کا جو وصف پایا جاتا ایسا اردو کی کسی دوسری مثنوی میں نہیں ملتا۔

6.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
گوتر	نسب، خاندان
باقیات الصالحات	باقی رہنے والی نیکی
دبستان	اسکول، مکتبۂ فکر
خیابان	وہ چوڑا راستہ جس دونوں طرف پیڑ لگے ہوں
مسجع و مقفیٰ	سجی ہوئی اور با قافیہ عبارت
پر تکلف	شاندار
فوج ظفر موج	کامیاب فوج یا جماعت

ممد	مددگار
نبردآزما	سامنا کرنا
حرافہ	چالاک،مکار
نخل	کھجورکادرخت
شمشاد	ایک خوش قد درخت
موبراندام	جس کے رونگٹے کھڑے ہوں،خوف زدہ
برگ	پتّا

6.8 کتب برائے مطالعہ

1. گلزارنسیم	مرتبہ رشید حسن خاں
2. اردو کی تین مثنویاں	پروفیسر خان رشید
3. اردو مثنویاں شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین
4. جدید اردو مثنوی فن اور فکری ابعاد	ظفر انصاری ظفر

بلاک:2 رباعی

اکائی ۷: رباعی کا فن، خصوصیات اور آغاز وارتقا/رباعی کی تعریف اور اس کی فنی خصوصیات

اکائی ۸: اردو میں رباعی گوئی کا آغاز وارتقا

اکائی ۹: حالی: حیات اور رباعی گوئی

اکائی ۱۰: یاس یگانہ چنگیزی: حیات اور رباعی گوئی

اکائی ۱۱: اکبر الہ آبادی: حیات اور رباعی گوئی

اکائی ۱۲: امجد حیدر آبادی: حیات اور رباعی گوئی

اکائی ۱۳: فراق گورکھپوری: حیات اور رباعی گوئی

اکائی ۱۴: اہم رباعی گو شعرا کی رباعی گوئی کا اجمالی جائزہ

اکائی 7. رباعی کا فن، خصوصیات اور آغاز وارتقا/رباعی کی تعریف اور اس کی فنّی خصوصیات

ساخت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 رباعی کا فن اور خصوصیات

7.4 رباعی کا آغاز وارتقا

7.5 خلاصہ

7.6 آپ نے کیا سیکھا

7.7 اپنا امتحان خود کیجئے

7.8 سوالات کے جوابات

7.9 کلیدی الفاظ

7.10 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ رباعی کے فن اور اس کی خصوصیات سے آگاہ ہوں گے۔

رباعی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف سے آگاہ ہوں گے۔

رباعی کے آغاز وارتقا سے آگاہ ہوں گے۔

7.2 تمہید

طلبائے گرامی! ماقبل کی اکائیوں میں آپ مثنوی کے فن سے خاطر خواہ آگہی حاصل کر چکے ہیں۔اب آپ دوسرے بلاک کی پہلی اکائی میں رباعی کے فنی خصوصیات اور اس کے آغاز وارتقا سے متعارف ہوں گے۔ نیز رباعی کی تعریف سے واقفیت حاصل کریں گے۔

7.3 رباعی کا فن، خصوصیات اور آغاز وارتقا/رباعی کی تعریف اور اس کی فنی خصوصیات

7.3.1 رباعی کا فن

رباعی اردو شاعری کی ایک مشہور صنف سخن ہے جو زمانۂ قدیم سے اردو زبان میں رائج ہے۔اردو رباعی گوئی بھی دیگر اصناف سخن کی طرح فارسی ادب سے مستعار ہے اور اسی کے زیر سایہ پروان چڑھی۔رباعی کی ابتدا، اس کے موجد اور کس زبان سے اس کی شروعات ہوئی ان تینوں باتوں میں محققین کی آرا مختلف ہیں لیکن قرین قیاس بات یہ ہے کہ رباعی کی ابتدا ۲۵۱ھ میں یعقوب بن لیث صفار کے عہد میں ہوئی اور اکثر محققین نے اس کے ایجاد کا سہرا رودکی کے سر باندھا ہے۔رودکی فارسی زبان کا شاعر تھا چنانچہ اس صنف کی شروعات بھی فارسی زبان سے ہی مانی جاتی ہے۔

7.3.2 رباعی کی تعریف اور اس کی فنی خصوصیات

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جو 'رُبُـــعٌ' سے مشتق ہے جس کے لفظی معنٰی ہیں کسی چیز کا چوتھا حصہ۔لفظ رباعی عربی لفظ رُبَاعٌ کی طرف منسوب ہے جس کے معنی ہوئے اَیُ مَـا رُکِّـبَ مِنْ أَرْبَعَةٍ (یعنی جو شے چار جز سے مل کر بنی ہو) اور اس میں 'ی' نسبتی ہے جو لفظ رباع کی طرف اس کی نسبت کو ظاہر کرتی ہے۔گویا رباعی کا معنی ہوا چار والا۔شعری اصطلاح میں رباعی وہ صنف سخن ہے جس میں چار مصرعے ہوں یا جو دو اشعار پر مشتمل ہو۔اس کو دوبیتی بھی کہتے ہیں اور قدما نے اسے ترانہ کے نام سے بھی موسوم کیا ہے نیز اسے جفتی اور چار مصراعی کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ دوبیتی اور ترانہ رباعی کے موجودہ اور مروجہ اوزان میں نہیں لکھے جاتے تھے۔

اصطلاح میں رباعی اس منظوم کلام کو کہتے ہیں جو صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہو جس کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے اور اس کے اوزان متعین ہیں۔

رباعی میں کسی بھی موضوع کو پوری فنی چابکدستی سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ مصرع بہ مصرع خیال کا تسلسل ارتقا پاتا جائے اور چوتھے مصرع میں خیال اپنی تکمیل کو پہنچ جائے۔رباعی کا آخری مصرع بہت ہی معنی خیز ہونا چاہئے کیونکہ رباعی کے تینوں مصرعوں کا یہ خلاصہ ہوتا ہے اگر اس میں کسی قسم کا سقم ہوگا تو فنی طور پر وہ رباعی معیار سے گر جائے گی۔

افسوس کہ کوئی کام ہوتا ہی نہیں — جی بھر کے یہاں قیام ہوتا ہی نہیں
سننے والے تمام ہو جاتے ہیں — افسانہ مگر تمام ہوتا ہی نہیں

جوشؔ ملیح آبادی

ہر چیز مسبِّبِ سبب سے مانگو — منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں آگے غیر کے ہاتھ پھیلاتے ہو — بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

امجدؔ حیدر آبادی

مندرجہ ذیل بالا دونوں رباعیوں کو پڑھنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ان رباعیات میں سے ان کے آخری مصرعے حذف کر دیئے جائیں تو نہ صرف رباعیاں ناقص ہو جائیں گی بلکہ وہ اپنی معنویت واثر انگیزی بھی کھو دیں گی ۔اس سے یہ بات مبرہن ہو جاتی ہے کہ رباعی کی تکمیل اور اثر انگیری کا مکمل انحصار اس کے آخری مصرع پر ہے۔اس لیے ماہرین فن نے رباعی کے چوتھے مصرع کے پر تاثیر اور زوردار ہونے کی تاکید کی ہے۔

7.3.3 رباعی کے موضوعات

رباعی گوئی کے لئے کسی خاص موضوع ومضمون کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں ہر قسم کے خیالات کو نظم کیا جاسکتا ہے۔اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شعرا نے رباعیات میں فلسفہ،حکمت، اخلاق،عشق اور صوفیانہ افکار وخیالات کے علاوہ ہر قسم کے قدیم وجدید مسائل وموضوعات کو پیش کیا ہے۔

امت کو محمد سا شہنشاہ ملا　　گم راہ طلب تھی خضر راہ ملا
اور اس سے سوا کیا ملنا جو ملنا ہم کو　　اللہ کے محبوب سے اللہ ملا

جلیلؔ مانک پوری

اے عمر رواں کی رات آہستہ گذر　　اے ناظر کائنات آہستہ گذر
اک شے پہ بھی جمنے نہیں پاتی ہے نگاہ　　اے قافلۂ حیات آہستہ گذر

جوشؔ ملیح آبادی

مذکورہ بالا دونوں رباعیوں کے موضوعات الگ الگ ہیں۔پہلی رباعی نعتیہ ہے تو دوسری رباعی بے ثباتی حیات پر مبنی ہے۔اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رباعی کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ چنانچہ رباعی کی شناخت اس کے موضوع کے اعتبار سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی ہیئت کے لحاظ سے ہوتی ہے اسی لیے اس کا شمار اردو کی ہیئتی اصناف میں ہوتا ہے۔

7.3.4 رباعی کی ہیئت

مندرجہ ذیل رباعیات کو غور سے پڑھیں:

ممکن نہیں عبد سے عبادت تیری　　خُلق وکرم وعطا ہے عادت تیری
صحرا صحرا ہیں گو کہ عصیاں میرے　　دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

میر انیسؔ

پھر عشق نے آ کے دل سے پیغام کیا　　باتوں باتوں میں اپنا سب کام کیا
کوچے کوچے،گلی گلی،شہر شہر　　رسوا وخراب وخوار وبدنام کیا

حاتم

تشریف وہ یہاں نہ لائے افسوس　　مرتے دم بھی نہ آئے افسوس افسوس
سب رہ گئیں دل کی حسرتیں دل ہی میں　　افسوس افسوس ہائے افسوس

مومن

مجھ سے جو ملا آج وہ رشک خورشید　　چمکی مری تقدیر، بر آئی امید
میں خوش مرے احباب بھی خوش ہیں اے داغ　　سچ کہتے ہیں گھر عید تو باہر بھی عید

داغ دہلوی

طوفان میں ہے جب جہاز چکر کھاتا　　جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا　　واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

حالی

مندرجہ ذیل بالا رباعیات کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں 'عبادت' 'عادت' اور 'رحمت' قافیے ہیں تو دوسری رباعی میں 'پیغام' 'کام' اور 'بدنام' قافیے ہیں تو تیسری رباعی میں 'لائے' 'آئے' اور 'ہائے' قافیے ہیں جب کہ تینوں رباعیات کے تیسرے مصرعوں میں قافیہ مفقود ہے۔اس لیے جن مصرعوں میں قافیہ پایا جاتا ہے ان کو 'مقفّٰی مصرع' کہتے ہیں جبکہ تیسرے مصرع میں قافیہ موجود نہیں چنانچہ اسے 'خصّی' کہا جاتا ہے۔

ان تینوں رباعیات میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ان کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں قافیوں کے بعد کچھ بعض الفاظ مکرر آئے ہیں ان کو اصطلاح شعر میں ردیف (پیچھے آنے والا) کہتے ہیں لہٰذا ایسی رباعیات کو مردّف رباعی کہا جاتا ہے۔

اسی طرح جب آپ چوتھی رباعی کا مطالعہ کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں قافیہ تو موجود ہے مگر ردیف نہیں پائی جاتی چنانچہ ایسی رباعی کو اصطلاح میں 'غیر مردّف' رباعی کہتے ہیں۔

اسی طرح جب ہم پانچویں رباعی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ چاروں رباعیات کے برعکس اس کے چاروں مصرعوں میں قافیہ موجود ہے چنانچہ ایسی رباعی کو جس کے چاروں مصرعوں میں قافیہ پایا جائے اس کو اصطلاح شعر میں 'غیر خصّی رباعی' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کیونکہ کہ اس میں خصّی مصرع نہیں ہوتا۔

7.3.5 رباعی کے اوزان

رباعی کی سب سے اہم ہیئتی شناخت اس کے اوزان ہیں اس لیے کہ رباعی صرف مخصوص اوزان میں ہی

لکھی جاتی ہے اگر وہ اپنے مقررہ اوزان میں نہ ہو تو فنی طور پر اسے رباعی قرار نہیں دیا جائے گا۔ ماہرین عروض نے رباعی میں اوزان کی پابندی کو لازمی قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کے بہ قول ''رباعی کے لیے بحر ہزج ابتدا ہی سے متعین ہو چکی ہے۔ رباعی اخرب واخرم کے چوبیس اوزان ہی میں کہی جاتی ہے۔ اس لیے اساتذہ نے رباعی کو کسی اور بحر میں نہیں کہا البتہ ایسا ضرور ہوا ہے کہ رباعی کی بحر میں دیگر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔''

(اردو رباعیات، ڈاکٹر سلام سندیلوی، نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ، بار اول ۱۹۶۳ء، ص ۶۷)

رباعی کے ہر مصرع میں مخصوص وزن کے چار چار رکن ہوتے ہیں اور یہ چاروں ارکان بیس بیس ماتراؤں پر مشتمل ہوتے ہیں اس ارکان کو اصطلاح میں افاعیل کہا جاتا ہے۔ کسی بھی رباعی کے ایک مصرعے میں چار افاعیل ہی ہوتے ہیں اور ان کی تعداد میں کمی وبیشی نہیں ہوتی۔

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ مبرہن ہو جاتا ہے کہ رباعیات اپنے مقررہ اوزان میں ہی لکھی جاتی ہیں اور ان اوزان سے ہٹ کر لکھی ہوئی چار مصرعوں کی نظم کو اہل عروض رباعی نہیں مانتے بلکہ اس کو قطعہ وغیرہ کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ رباعی گوئی کے لیے چوبیس (۲۴) اوزان مقرر ہیں جن کا تعلق بحر ہزج سے ہے۔ یہ چوبیس اوزان دو زمروں میں منقسم ہیں۔ پہلا اخرب اور دوسرا اخرم پھر ہر ایک سے بارہ (۱۲) اوزان بنتے ہیں جو دو بنیادی وزن کے تحت آتے ہیں۔ دونوں بنیادی اوزان حسب ذیل ہیں:

(۱) مفعول مفاعیل مفاعیل فَعَل

(۲) مفعول مفاعِلن مفاعیل فَعَل

شجرۂ اخرب کے بارہ اوزان حسب ذیل ہیں:

۱۔ مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

۲۔ مفعول مفاعیل مفاعیل فعول

۳۔ مفعول مفاعیل مفاعیلن فع

۴۔ مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع

۵۔ مفعول مفاعیلن مفعول فعَل

۶۔ مفعول مفاعیلن مفعول فعول

۷۔ مفعول مفاعیلن مفعولن فع

۸۔ مفعول مفاعیلن مفعولن فاع

۹۔ مفعول مفاعِلن مفاعیل فعَل

۱۰۔ مفعول مفاعِلن مفاعیل فعول

۱۱۔ مفعول مفاعِلن مفاعیلن فع

۱۲۔ مفعول مفاعِلن مفاعیلن فاع

شجرۂ اخرم کے بارہ اوزان حسب ذیل ہیں:

۱۳۔ مفعولن مفعول مفاعیل فعل

۱۴۔ مفعولن مفعول مفاعیل فعول

۱۵۔ مفعولن مفعول مفاعیلن فع

۱۶۔ مفعولن مفعول مفاعیلن فاع

۱۷۔ مفعولن مفعولن مفعول فعل

۱۸۔ مفعولن مفعولن مفعول فعول

۱۹۔ مفعولن مفعولن مفعولن فع

۲۰۔ مفعولن مفعولن مفعولن فاع

۲۱۔ مفعولن فاعلن مفاعیل فَعَل

۲۲۔ مفعولن فاعلن مفاعیل فعول

۲۳۔ مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

۲۴۔ مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع

اہل عروض نے ان چوبیس اوزان ہی میں رباعی کہنے کی اجازت دی ہے البتہ یہ آزادی ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعے مختلف الاوزان ہو سکتے ہیں اور ایک ہی وزن میں بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ شاعر کی صوابدید پر منحصر ہے۔ یہاں بطور نمونہ چند رباعیات کی تقطیع کی جارہی ہے تاکہ آپ رباعی کی ہیئت اور اس کے اوزان کو بخوبی سمجھ سکیں۔

7.3.6 رباعی کی تقطیع

اے مرد خدا نفس کو اپنے پہچان　　انسان یقین ہے اور اللہ گمان

میری بیعت کے واسطے ہاتھ بڑھا　　پڑھ کلمہ لا الہ الا انسان

جوشؔ ملیح آبادی

اے مرد خ دا نفس ک اپ نے پہ چان

مفعول مفاعیل مفاعیلن فعل (فع)

ان سان ی قی ن ہے ارل لاہ گ مان

مفعول مفاعلن مفاعیل فعول

می ری بی عت ک وا س طے ہات ب ڑا

مفعولن فاعلن مفاعیل فعل

پڑ کل مہ لا الہ ہ ال لا ان سان

مفعولن فاعلن مفاعیلن فعل

باز آؤ دمِ عشق کے اب بھرنے سے آسیؔ ڈرتے نہیں ہو تم مرنے سے

مجنوں کے لب گور سے آتی ہے صدا مرنا بہتر ہے عاشقی کرنے سے

آسیؔ غازیپوری

باز اوو دم عش ق ک اب برنے سے

مفعولن مفعول مفاعیلن فع

آ سی ڈر تے ن ہی ہ تم مرنے سے

مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

مج نون ک لب گور س آتی ہ ص دا

مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

مرنا بہ تر ہ عا س قی کرنے سے

مفعول فاعلن مفاعیلن فع

7.3.7 رباعی کا آغاز وارتقا

رباعی عربی اور فارسی دنوں زبان میں قدیم دور سے پائی جاتی ہے۔علامہ سید سلیمان ندوی رباعی کو عرب شعرا کی ایجاد مانتے ہیں۔جب کہ محمود شیرانی اور ان کے تتبع میں اکثر محققین فارسی شعرا کو اس کا موجد گردانتے ہیں اور اسی بات کو معتبر مانا گیا ہے۔رباعی اگر چہ ایران کی ایجاد نہ ہوتو بھی اہل ایران نے جس طور پر اس صنف کی آبیاری کر کے اسے بام عروج تک پہنچایا ہے اس سے کسی طرح انکار ممکن نہیں۔رباعی ایک ہیئتی صنف ہے اور اس کے اوزان ہی اس کو دوسری اصناف سے ممیّز کرتے ہیں۔رباعی بحر ہزج میں کہی جاتی ہے۔فارسی کے محققین نے اسے ترانہ، دوبیتی، چار مصراعی وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا ہے۔رباعی کے ایجاد کا مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے اور اس کے متعلق کئی افسانے محققین نے بیان کئے ہیں لیکن ان کے تحلیل و تجزیہ سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ رباعی قدیم زمانے میں رائج ترانہ یا دوبیتی کی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔جیسا کہ محمود شیرانی کی رائے ہے۔ترانہ دراصل نغمہ و سرود کو کہتے ہیں اور یہ آہنگ سے بھر پور صنف ہے جو خصوصاً عورتوں اور بچوں میں رائج تھی اس کی مقبولیت کے

پیش نظر ایران کے موسیقی کاروں نے اس صنف میں بہت سے دل پذیر نغمات مختلف راگوں میں پیش کئے جس نے عوام اور صوفیہ دونوں کے دلوں کا گرمایا۔

اس مقبولیت نے بہت سے شعرا کو اس صنف کی طرف متوجہ کیا اور انھوں نے اس صنف کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ ادبی مورخین کی اکثریت نے رودکی کو رباعی کا موجد تسلیم کیا ہے۔ رباعی کی ایجاد کے تعلق سے یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بچہ گولیوں سے کھیل رہا تھا وہ دور سے گولیوں کو ایک گڑھے میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک گولی کے علاوہ ساری گولیاں گڑھے میں چلی گئیں لیکن ایک گولی گڑھے کے کنارے دیر تک لڑھک رہی تھی جس سے بچہ کچھ مایوس سا ہو گیا پھر اچانک وہ گولی بھی گڑھے میں کر گئی تو بچہ خوشی سے چلا اٹھا اور اس کے منھ سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا:

غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گوئے

اتفاق سے رودکی اس وقت وہاں موجود اس نے جوں ہی یہ جملہ سنا اسے یہ موزوں جملہ بہت پسند آیا اور اس نے اسی بحر میں تین شعر اور کہے اس طرح رباعی کا ظہور ہوا۔ لیکن محققین اس روایت کو افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے چنانچہ انھوں نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق الگ الگ لوگوں کو پہلا رباعی گو قرار دیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے شیخ بایزید بسطامی کو پہلا رباعی گو مانا ہے جب کہ حافظ محمود شیرانی نے عبدالشکور بلخی کو اولین رباعی گو قرار دیا ہے۔ اس صورت حال میں کسی ایک متعین شخصیت کو پہلا رباعی گو قرار دینا ممکن نہیں۔ لیکن یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ رودکی نے اس صنف کو استحکام بخشنے میں لائق تحسین خدمت انجام دی ہے۔ اس نے رباعی کی ساخت اور اس کے اوزان مرتب کئے جو کل چوبیس ہیں اس سے مستخرج ہونے والے اوزان تعداد میں بے شمار ہیں۔ اس کا سب سے معروف وزن "لا حول ولا قوۃ الا باللہ" ہے۔

رباعی ایک مختصر صنف ہے چنانچہ اس کو برتنے کے لیے شاعر کو بہت ہی حاضر دماغی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے اوزان متعین ہیں وزن کی پابندی کے ساتھ ساتھ وحدت خیال، تسلسل اور برجستگی کو پیش نظر رکھا از حد ضروری ہے تا کہ رباعی حقیقی معنوں میں رباعی ہو سکے۔ رباعی کے پہلے مصرع میں کسی خیال کی تمہید پیش کی جاتی ہے پھر دوسرے اور تیسرے مصرع میں اسی فکر کو مزید ابھارا جاتا ہے اور چوتھے اور آخری مصرع میں وہ خیال کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ رباعی کا آخری مصرع پوری رباعی کی روح ہوتا ہے۔ اگر یہ چست اور فیصلہ کن نہ تو رباعی اپنی تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ شیخ بایزید بسطامی، رودکی اور عبدالشکور بلخی کے علاوہ فارسی رباعی میں اہم ترین شاعر شیخ ابوسعید ابوالخیر ہیں جن کی رباعیات میں تصوف، عشق، اخلاق اور فلسفہ کا عنصر غالب ہے۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر نے سب سے پہلے فارسی رباعیات میں مختلف موضوعات کو کامیابی کے ساتھ برت کر دکھایا۔ ان کی تقلید میں شیخ فریدالدین عطّار اور مولانا رومؔ نے بھی متنوع موضوعات پر مبنی رباعیات تخلیق کیں۔ مولانا رومؔ نے اپنی رباعیات میں

خمریات کے موضوع کو بھی برتا ہے۔لیکن جس پائے کی خمریہ رباعیات عمر خیاؔم نے کہی ہیں ویسی آج تک کوئی دوسرا نہیں کہہ سکا۔خیاؔم اور خمریات ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہو گئے ہیں۔خیاؔم کے بعد شیخ سعدیؔ شیرازی مولانا عبدالرحمٰن جاؔمی،خواجہ شمس الدین محمد شیرازی حافظؔ فارسی کے اہم رباعی گویوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ہندوستان میں فارسی رباعی گویوں میں طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرؔو،شیخ بوعلی شاہ قلندر پانی پتی،صوفی سرؔمد شہید،عبدالقادر بیدؔل کے اسماء اہم ترین ہیں۔متاخرین میں غالبؔ،اقبالؔ اور امجؔد وغیرہ نے فارسی میں اچھی رباعیات کہی ہیں۔فارسی رباعی گوئی کا یہ ایک اجمالی جائزہ ہے۔فارسی میں رباعی گوئی کی روایت بہت مستحکم وتوانا رہی ہے اکثر اساتذہ نے کچھ نہ کچھ رباعیات ضرور کہی ہیں۔جس سے نہ صرف ہیئتی سطح پر تنوع دکھائی دیتا ہے بلکہ اس میں گوناگوں موضوعات بھی وافر مقدار میں ملتے ہیں۔فارسی رباعی میں عموماً توحید ومعرفت،عشق حقیقی،اخلاق،فلسفہ،خمریات وغیرہ کے موضوعات عام طور پر ملتے ہیں جس سے خاص عام بقدر استطاعت محظوظ ہوتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری وساری ہے۔

7.5 خلاصہ

رباعی عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنیٰ چار والا کے ہیں۔اصطلاح میں رباعی چار مصرعوں پر مشتمل کلام کو کہتے ہیں جس کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔لیکن تیسرا مصرعہ عموماً قافیہ سے خالی ہوتا ہے۔ان ہی چار مصرعوں میں کوئی بھی مضمون بہت ہی منظّم اور مربوط انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔اس کا ہر مصرعہ ایک اکائی کی حیثیت کا حامل ہوتا جو خیال کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔چوتھا مصرعہ اتنا چست ہوتا کہ اس میں تینوں مصرعوں میں پیش کردہ خیال تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔بلکہ حقیقت میں رباعی کی کامیابی کا زیادہ تر انحصار چوتھے مصرعے پر ہی ہوتا ہے۔اگر رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ اور ہم ردیف دونوں ہوں اور تیسرے مصرعے میں قافیہ وردیف دونوں نہ ہو تو ایسی رباعی کو اصطلاح میں 'خصی' کہتے ہیں۔اس کے برعکس اگر رباعی کے چاروں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں تو اس رباعی کو اصطلاح میں 'غیر خصی' کہا جاتا ہے۔رباعی میں اس کے مخصوص بحر اور اوزان کا ہونا ضروری ہے۔اس کے لئے بحر ہزج کے چوبیس اوزان متعین ہیں جن کو مختلف انداز میں استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن اصول وضوابط کی پابندی اس میں بھی ضروری ہے۔رباعی اپنی داخلی اور ہیئت میں کافی پیچیدہ اس لئے کافی مشق سخن کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے بہت سے شعرا نے اس کو برتنے سے گریز کیا ہے۔اسی لئے اس کو نازک اور مشکل صنف کہا گیا ہے۔رباعی میں موضوعات پر کسی طرح کی پابندی نہیں ہے لیکن قدیم ادب میں رباعی مذہبی اخلاقی،عشقیہ اور فکر وفلسفہ تک محدود تھی لیکن مرور زمانہ کے ساتھ اس کے موضوعات میں بھی تنوع پیدا ہو گیا اس رباعی سیاسی،سماجی،معاشی،ذاتی وغیرہ ہر قسم کے موضوعات کو اس نے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔اردو کے پہلے رباعی گو شاعر محمد قلی قطب شاہ ہیں ان کے بعد

دکن میں شعرا کی ایک بڑی تعداد نے رباعی کو فروغ دیا۔شمالی ہندوستان میں ولی کے آنے سے بعد جب ریختہ کی شاعری کو فروغ ہوا تو یہاں بھی تمام اساتذۂ فن نے اس صنف پر طبع آزمائی کی ۔دہلی سے یہ روایت لکھنؤ پہنچی یہاں کے مرثیہ گویوں نے اس کو کافی فروغ دیا اس کے بعد ہندوستان کے ہر ہر کونے میں بہتیرے شعرا نے اس صنف کو ترقی دی ۔اب یہ صنف ادب میں پوری طرح استحکام حاصل کر چکی ہے اور اس میں روز افزوں ترقی ہوتی جارہی ہے۔

7.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے مطالعے سے آپ نے مندرجہ ذیل معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

رباعی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف۔

رباعی کا فن اور اس کی صنفی خصوصیات۔

رباعی کے موضوعات، اس کے اوزان اور اس کی تقطیع۔

رباعی کا آغاز وارتقا۔

7.7 اپنا امتحان خود کیجئے

1. رباعی کی لغوی و اصطلاحی تعریف بیان کیجئے؟

2. خصی اور غیر خصی رباعی سے کیا مراد ہے؟ مثالوں سے واضح کیجئے۔

3. رباعی کی صنفی خصوصیات مختصراً بیان کیجئے؟

4. رباعی کے موضوعات پر روشنی ڈالیے

5. رباعی کے آغاز وارتقا پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیے

7.8 سوالات کے جوابات

1. رباعی کے لغوی معنیٰ 'چار والا' ہیں۔اصطلاح میں رباعی اس مختصر نظم کو کہتے ہیں جس میں چار مصرعے ہوں اور وہ بحر ہزج کے چوبیس اوزان میں سے کسی ایک وزن میں ہو۔اس کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ تیسرے مصرعے میں قافیہ کی شرط نہیں ہے۔رباعی میں چار مصرعوں میں ہی کسی خیال کو مربوط انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

2. اگر رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ یا ہم ردیف ہوں اور تیسرے مصرعے میں قافیہ وردیف نہ ہوتو اصطلاح میں ایسی رباعی کو 'خصی' کہتے ہیں۔جیسے:

باز آؤ دمِ عشق کے اب بھرنے سے　　　　آتی ڈرتے نہیں ہو تم مرنے سے

مجنوں کے لب گور سے آتی ہے صدا　　　　مرنا بہتر ہے عاشقی کرنے سے

آسی غازیپوری

اس کے برعکس اگر رباعی کے چاروں مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوں تو اس کو اصطلاح میں 'غیر خصی' کہتے ہیں جیسے:

طوفان میں ہے جب جہاز چکر کھاتا　　جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا　　واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

حالی

مذکورہ بالا رباعی کے تمام مصرعے ہم قافیہ ہیں۔کھاتا،ٹکراتا، جاتا اور آتا قافیہ ہیں۔اس میں عام رباعی کی طرح تیسرا مصرع بے قافیہ نہیں ہے اس لئے اس کو 'غیر خصی' کہا جاتا ہے۔

3. رباعی چار مصرعوں پر مشتمل ایک ایسی نظمیہ صنف ہے۔جو بحر ہزج کے چوبیس اوزان میں ہی کہی جاتی ہے۔ جب کوئی موضوع چار مصرعوں میں ڈھل جائے اور اس میں قافیہ اور ردیف یا صرف قافیہ موجود ہو اور وہ رباعی کے کسی بحر و وزن میں ہو تو اسے رباعی کہا جائے گا۔اگر کوئی مضمون یا خیال رباعی کے متعینہ اوزان میں سے نہ ہو تو اسے قطعہ یا ترانہ وغیرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔یعنی رباعی کی بنیادی خصوصیت اس کے اوزان یا اس کی ہیئت ہے علاوہ ازیں رباعی کے چاروں مصرعے باہم مربوط ہوتے ہیں۔رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع عموماً ہم قافیہ وہم ردیف ہوتا ہے۔تیسرے مصرع میں قافیہ و ردیف نہیں ہوتا۔رباعی میں کسی خیال کا ابتدائی حصہ پہلے دو مصرعوں میں بیان کیا جاتا ہے اور اس کا ارتقا تیسرے مصرعے میں ہوتا ہے جب کی آخری مصرعے میں اس کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔رباعی کے لئے متعینہ اوزان کا ہونا ضروری ہے لیکن تمام مصرعوں کا ایک ہی وزن میں ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ہر مصرعے میں الگ الگ وزن بھی ہو سکتے ہیں۔اس لئے رباعی کو موضوعاتی صنف نہیں گردانا جاتا بلکہ اسے ہیئتی صنف مانا جاتا ہے۔

4. رباعی ایک ایسی صنف ہے جس میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔قدیم زمانے میں فارسی اور اردو دونوں میں موضوع کے اعتبار سے زیادہ تنوع نہیں پایا جاتا تھا بلکہ وہ کچھ مخصوص موضوعات تک محدود ہوگئی تھی۔مثلا قدیم دور میں رباعی میں عموماً مذہب، اخلاق، عشق اور فلسفہ ہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔لیکن زمانے کی تبدیلی کے ساتھ اس میں بھی تبدیلی آنا شروع ہوگئی اور اس نے رفتہ رفتہ تمام موضوعات کو اپنے دائرۂ سخن میں سمولیا۔اس لئے آج رباعی میں ہر قسم کے افکار و خیالات کی ترجمانی پائی جاتی ہے۔جو اس کی فنی وسعت پر دلالت کرتی ہے۔

5. رباعی عربی اور فارسی دنوں زبان میں قدیم دور سے پائی جاتی ہے۔علامہ سید سلیمان ندوی رباعی کو عرب شعرا کی ایجاد مانتے ہیں۔جب کہ محمود شیرانی اور ان کے تتبع میں اکثر محققین فارسی شعرا کو اس کا موجد گردانتے ہیں اور اسی کو معتبر مانتے ہیں۔رباعی اگر چہ ایران کی ایجاد نہ ہو تو بھی اہل ایران نے جس طور پر اس

صنف کی آبیاری کر کے اسے بام عروج تک پہنچایا ہے اس سے کسی طرح انکار ممکن نہیں ۔ رباعی ایک ہیئتی صنف ہے اور اس کے اوزان ہی اس کو دوسری اصناف سے ممیّز کرتے ہیں ۔ رباعی کو بحر ہزج میں کہی جاتی ہے ۔ فارسی کے محققین نے اسے ترانہ، دو بیتی، چار مصراعی وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا ہے ۔ رباعی کے ایجاد کا مسئلہ مختلف فیہ ہے اس بارے سب سے قرین قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے ترانہ وغیرہ کی صنف زمانہ کے ساتھ ترقی کرتے ہوئے رباعی کی خاص صورت میں ڈھل گئی ہے ۔ بعد میں اس میں قافیہ، ردیف اور وزن کے شرائط جڑتے چلے گئے ۔

فارسی میں رباعی کے ایجاد کا سہرا عموماً رودکی کے باندھا جاتا ہے لیکن سید سلیمان ندوی نے پہلا رباعی گو شیخ بایزید بسطامی کو قرار دیا ہے جب کہ محمود شیرانی نے عبدالشکور بلخی کو پہلا رباعی گو قرار دیا ہے ۔ اس صنف کو فروغ دینے میں شیخ بایزید بسطامی، رودکی، عبدالشکور بلخی شیخ ابوسعید ابوالخیر کے نام اہمیت کے حامل ہیں ۔ شیخ ابوسعید ابو الخیر نے سب سے پہلے فارسی رباعیات میں مختلف موضوعات کو کامیابی کے ساتھ برت کر دکھایا ۔ ان کی تقلید میں شیخ فرید الدین عطّار اور مولانا رومؔ نے بھی متنوع موضوعات پر مبنی رباعیاں تخلیق کیں ۔ مولانا رومؔ نے اپنی رباعیات میں خمریات کے موضوع کو بھی برتا ہے لیکن جس پائے کی خمریہ رباعیات عمر خیامؔ نے کہیں ہیں ویسی آج تک کوئی دوسرا نہیں کہہ سکا ۔ خیامؔ اور خمریات ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہو گئے ہیں ۔ خیامؔ کے بعد شیخ سعدیؔ شیرازی مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ، خواجہ شمس الدین محمد شیرازی حافظؔ فارسی کے اہم رباعی گویوں میں شمار کئے جاتے ہیں ۔ ہندوستان میں فارسی رباعی گویوں میں طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو، شیخ بوعلی شاہ قلندر پانی پتی، صوفی سرمد شہید، عبدالقادر بیدلؔ کے اسماء اہم ترین ہیں ۔ متاخرین میں غالبؔ، اقبالؔ اور امجدؔ وغیرہ نے فارسی میں اچھی رباعیات کہی ہیں ۔ فارسی رباعی میں عموماً توحید و معرفت، عشق حقیقی، اخلاق، فلسفہ، خمریات وغیرہ کے موضوعات عام طور پر ملتے ہیں جس سے خاص عام بقدر استطاعت محظوظ ہوتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری و ساری ہے ۔

7.9 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
صنف	قسم، شعر یا نثر میں کوئی تخلیقی چیز جیسے غزل، قصیدہ، ناول
لغوی	لغت کے مطابق، لغت میں کسی لفظ کے کیا معنیٰ ہیں
ہیئت	ساخت، بناوٹ، شکل و صورت
ہزج	علم عروض کی ایک بحر کا نام، شاعری کے مخصوص اوزان کی ایک بحر

قطعہ	ٹکڑا، حصہ، ایک شعری صنف کا نام
خصّی	وہ جانور جس کے فوطے نکال دیے گئے ہوں، رباعی کی اصطلاح میں بے ردیف مصرع
خمر	نشہ لانے والی چیز، وہ شعر جس میں شراب کا ذکر ہو خمریہ کہلاتا ہے
مبرہن	واضح ہونا، ظاہر ہونا
ساخت	بناوٹ
تمہید	ابتدا، شروعات
کلید	کنجی، چابی
ارتقا	ترقی کرنا، آگے بڑھنا
موجد	ایجاد کرنے والا، بنانے والا
جفت	جوڑا، دو
مِنَّت	احسان،
حذف	مٹانا، ختم کرنا
خُلق	عادت واطوار
زمرہ	گروہ، جماعت، فرقہ

7.10 کتب برائے مطالعہ

1. اردو رباعیات	ڈاکٹر سلام سندیلوی
2. تنقید رباعی	ڈاکٹر فرید پربتی
3. خیام	علامہ سید سلیمان ندوی
4. اصناف سخن اور شعری ہیئتیں	شمیم احمد
5. بحر الفصاحت	مولانا نجم الغنی خاں رامپوری

اکائی 8. اردو میں رباعی گوئی کا آغاز وارتقا

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 اردو رباعی کا آغاز وارتقا

8.3.1 دکن میں اردو رباعی کا آغاز وارتقا

8.3.2 شمالی ہند میں اردو رباعی کا آغاز وارتقا

8.4 خلاصہ

8.5 آپ نے کیا سیکھا

8.6 اپنا امتحان خود کریں

8.7 سوالات کے جوابات

8.9 کلیدی الفاظ

8.10 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ رباعی کے فن، صنفی خصوصیات اور روایت کے اجمالی تذکرہ سے واقف ہوں گے۔ جو آموختہ کی حیثیت کا حامل ہوگا۔

دکن میں اردو رباعی کے نشو ونما اور وہاں کے نمائندہ رباعی گویوں سے آپ متعارف ہوں گے اور ان کے کلام کی خصوصیات وامتیازات سے واقفیت حاصل کریں گے۔

شمالی ہند کے اردو رباعی کے نشو ونما اور وہاں کے نمائندہ رباعی گویوں سے آپ متعارف ہوں گے اور ان کے کلام کی خصوصیات وامتیازات سے واقفیت حاصل کریں گے۔

8.2 تمہید

طلبائے گرامی ! گزشتہ اکائی میں آپ رباعی کے فن، اس کی صنفی خصوصیات، رباعی کے موضوعات، رباعی کے اوزان، فارسی میں رباعیات کے آغاز وارتقا سے کما حقہ واقف ہو چکے ہیں اب اس اکائی میں آپ اردو

میں صنف رباعی کے آغاز وارتقا سے واقفیت حاصل کریں گے ۔اولاً ہم دکن میں رباعی گوئی کی روایت سے متعارف ہوں گے اور وہاں کے نمائندہ رباعی گویوں کے کلام سے استفادہ کریں گے ۔ثانیاً ہم شمالی ہند میں رباعی گوئی کی روایت سے متعارف ہوں گے اور وہاں کے نمائندہ رباعی گویوں کے کلام سے استفادہ کریں گے ۔اس اکائی کے مطالعہ سے ہم اردو رباعی گوئی کی روایت سے واقف ہوسکیں گے اور عہد بہ عہد رباعی کی زبان اور اس کے موضوعات میں ہونے والی تبدیلیوں کا صحیح طور سے اندازہ لگاسکیں گے ۔

8.3 اردو رباعی گوئی کا آغاز وارتقا

8.3.1 دکن میں اردو رباعی کا آغاز وارتقا

اردو کی اکثر و بیشتر اصناف سخن فارسی سے مستعار ہیں ۔رباعی بھی ان ہی میں سے ایک صنف جو من وعن فارسی سے اردو میں آئی ۔اردو رباعی کی ابتدا خطۂ دکن میں ہوئی جس کے اولین نمونے ہمیں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے یہاں ملتے ہیں ۔جن کے دیوان میں کل ۳۹/ رباعیات ملتی ہیں ۔اب تک ان سے پہلے کسی شاعر کے یہاں رباعی کا نمونہ دستیاب نہیں ہوسکا ہے ۔اس بنا پر محمد قلی قطب شاہ باقاعدہ اردو کے پہلے رباعی گو شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں ۔بعض محققین نے بہت سعی وجستجو کے بعد ایک دو شعرا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر ان حضرات کا کلام دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہوتا تو شاید ہمیں محمد قلی قطب شاہ سے قبل بھی رباعی کے نمونے مل سکتے تھے لیکن یہ محض خیالی باتیں ہیں کیوں کہ جب تک کلام دستیاب نہ کوئی بھی دعویٰ قبول نہیں کیا جاسکتا ۔یہ بات اب محقق ہوچکی ہے اب تک دستیاب شدہ مواد کی روشنی میں محمد قلی قطب شاہ اردو کے اولین رباعی گو شاعر ہیں ۔ان کی رباعیات کے موضوعات گوناں گوں اور متنوع ہیں ۔وہ بنیادی طور پر حسن وعشق کے شاعر تھے چنانچہ ان کی دیگر اصناف شاعری کی طرح ان کی رباعیات بھی خصوصیت کے ساتھ حسن وعشق کا مرقع ہیں ۔عشقیہ موضوعات کے علاوہ ان کے یہاں مذہبی موضوعات بھی پائے جاتے ہیں ۔انھوں نے مذہبی موضوعات کے تحت حمد ،نعت اور منقبت کہی ہیں اسی طرح دنیا کی بے ثباتی اور تصوف سے متعلق بھی بعض رباعیات پائی جاتی ہیں لیکن ان کی رباعی گوئی کا سارا جوہر عشقیہ رباعیات میں ہی کھلتا ہے اور یہی ان کا امتیاز بھی ہے ۔فارسی رباعی کے بر عکس انھوں نے اخلاق اور فلسفے کے موضوع کو کم اہمیت دی ہے اور عشقیہ موضوع کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ۔اردو میں رباعی گوئی کا یہ ابتدائی تجربہ تھا اس لیے ان کی بعض رباعیات ناہمواری کا شکار نظر آتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی کچھ رباعیات بہت ہی سلیس اور رواں بھی ہیں ۔قلی قطب شاہ کی دو رباعیات ملاحظہ ہوں:

تج حسن تھے تازہ ہے سدا حسن و جمال　　تجھ یاد کی مستی اہے عشق کوں حال
توں ایک ہے تجسا نہیں دوجا کہیں　　کیوں پاوے جگت صفحے میں کوئی تیرا مثال

مستی کے ملک میں ہے جہانبانی منجے　　خوباں کوں دیکھن میں ہے مسلمانی مجھے
خمار کا خمخانہ اہے ٹھانوں مرا　　ہر مدکا سو بند نگین سلیمانی منجے

ملا وجہی دکن کے مایہ ناز شاعر تھے۔ یہ محمد قلی قطب شاہ کے ہم عصر ہیں اگر چہ ان کی شاعرانہ شہرت قلی قطب شاہ کے بعد ہوئی۔ یہ دکن کے کئی بادشاہوں (ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ) کے دربار سے وابستہ رہے۔ ان کے کلام میں باضابطہ طور پر رباعی نہیں ملتی بلکہ انھوں نے اپنی مثنوی 'قطب مشتری' میں حسب ضرورت غزل کے ساتھ رباعیات بھی لکھی ہیں جن کی تعداد نو ہے۔ اسی طرح ان کی ایک رباعی سب رس میں بھی ملتی ہے۔ ان کی رباعیات کی زبان قدیم دکنی اردو ہے۔ ان کا انداز بیان بھی قلی قطب شاہ کے ہی مثل ہے جن میں بعض نامانوس الفاظ بھی ملتے ہیں جس سے اس کے مطالب کو سمجھنے میں کافی دقت پیش آتی ہے۔ بطور نمونہ ایک رباعی دیکھئے:

میں نار ہسوں اس شہر تلک جائے بن　　چنچل سکی کا چک درس پاے بن
اس جیو دوانے کوں کیوں ہوے قرار　　اس نار کو اس ٹھار لے آئے بن

غواصی بھی دکن کے اہم ترین شعرا میں سے ایک ہے۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ غواصی کی وجہ شہرت اس کی تین عدد مثنویاں (سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، مینا ستونتی) ہیں۔ اس کے کلیات میں تیس رباعیات بھی ملتی ہیں جن میں تصوف، اخلاق، عشقیہ، خمریہ اور مدحیہ جیسے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ بطور مثال دو رباعیات ملاحظہ ہوں:

ہشیار کدھیں نا ہوے مستی میری　　مئے سات رنگی گئی ہے یو ہستی میری
جیوں چاند ہور آفتاب عالم میں　　مشہور ہے آج مئے پرستی میری

غواص تو حق باج کسے منگ نکو　　گرتوں ہے موحد تو کسو سنگ نکو
مارگ میں محبت کے ہیں کانٹے کانٹے　　کانٹاں پہ چلیا نپٹ سو جالنگ نکو

علی عادل شاہ ثانی عادل شاہی حکومت کا آٹھواں تاجدار کے ساتھ ساتھ ایک باکمال شاعر اور موسیقی کار بھی تھا۔ اس مطبوعہ کلیات میں اس کی ایک عدد رباعی ملتی ہے جو حسب ذیل ہے:

سب دیش گیا ہے دھن تے لڑتے لڑتے　　گھٹ رات گئی ہے پانؤں پڑتے پڑتے
کیا ٹیک مدن کا اونچ لگتا ہے مجھے　　رھے پانؤں سڑی پرَت کی چڑتے چڑتے

علاوہ ازیں پروفیسر سیدہ جعفر نے پاکستان میں موجود کسی بیاض سے اس کی تین عدد رباعیات اور دریافت کی ہیں۔

نصرتی علی عادل شاہ شاہی کے دربار میں ملک الشعرا کے عہدے پر فائز تھا۔اس نے مثنویات کے باب میں کافی شہرت پائی ۔اس کی تصانیف میں علی نامہ،گلشن عشق اور تاریخ اسکندری اہم ہیں علاوہ ازیں اس کے دیوان مرتبہ جمیل جالبی میں اٹھائیس عدد رباعیات درج ہیں جو زیادہ تر اخلاقی مضامین پر مشتمل ہیں۔ایک رباعی بطور نمونہ پیش خدمت ہے:

اے اسم ترا سب میں مجے وافی ہے　　ہر دردکوں اس دل کے وہی شافی ہے
غیرت ہے مرے جیوکوں ترے غیر کی آس　　یک تو نج دو عالم میں مجے کافی ہے

مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ فیروزی، میراں جی خدانما، متقی، میراں یعقوب، گوہری، بابا شاہ حسینی، جانم ثانی ، پیر باشا حسینی، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی اور عبدالقادر حیدرآبادی وغیرہ رباعی گو شعرا مانے جاتے ہیں لیکن ان میں موخرالذکر تین شعرا ہی بطور رباعی گو خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

ولی دکنی اردو کے عہد ساز شاعر ہیں جن کے شعری دیوان نے پہلی بار دہلی میں پہنچ کر باقاعدہ ریختہ گوئی کے فن کو فروغ دیا۔ولی کا کلام اردو میں اپنی اپنی سادگی اور سلاست وروانی کے لئے معروف ہے۔اگر چہ انھوں اپنے کلام میں رباعیات کا کوئی بڑا ذخیرہ نہیں چھوڑا اس کے باوجود ان کی رباعی گوئی اہمیت کی حامل ہے اس کی وجہ یہ کہ اردو میں پہلی بار صحیح طور پر رباعی کے باب میں فارسی کا تتبع کیا گیا ہے۔انھوں نے تصوف،عشق،فلسفہ،اور مذہب وغیرہ کے موضوعات کو بخوبی برتا ہے۔جس میں سادگی،شیرینی اور جاذبیت پوری طرح سے رچی بسی ہے۔ ایک حمدیہ رباعی ملاحظہ ہو:

رکھ دھیان کوں ہر آن تو معبود طرف　　رکھ سیس کوں ہر حال میں مسجود طرف
معدوم کوں موجود سوں کیا نسبت　　اولیٰ ہے کہ مائل ہو تو موجود طرف

ولی دکنی کے بعد جس شاعر کو رباعی گوئی میں اہمیت حاصل ہے وہ سراج اورنگ آبادی ہیں۔سراج ایک صوفی تھے جو زیادہ تر وجد اور عالم استغراق میں رہتے اور اسی حالت زیادہ تر اشعار موزوں کرتے تھے۔ان کے کلیات میں بھی رباعیات موجود ہیں جن عموماً تصوف کے رموز نکات اور عشق کی کیفیات کا ذکر ملتا ہے ایک رباعی بطور مثال ملاحظہ ہو:

اس شوخ نے اب شیوہ تمکین لیا　　آئین وفا کا مذہب و دین لیا
ظالم نے ستم کیا مجھے بیکس بوجھ　　ٹک آنکھ دکھا کے دل مرا چھین لیا

عبدالقادر حیدرآبادی بھی دکن کے اہم رباعی گو شاعر تھے ان کے کوائف موجود نہیں ہے مگر ان کے دیوان کے مخطوطے میں غزلیات اور ایک عدد مثنوی کے علاوہ ۵۱ رباعیات بھی درج ہیں۔ایک رباعی بطور نمونہ پیش خدمت ہے:

کرتا ہے سحر عطر گریبان چمن　　لے خط سے ترے رایحہ ریحان چمن
رخ ہے ترا وہ شمع روشن جس سے　　ہے روشنیٔ شمع شبستان چمن

علاوہ ازیں مذکورہ شعرا کے علاوہ قدیم دکنی کے کچھ رباعی گو شعرا کے نام حسب ذیل ہیں پروانہ، شاہ عظیم، شہ میر، عزلت، مفتوں، عشق، آزاد، عبرت، تمنّا، آگاہ اور شاہ کمال۔ پھر انیسویں صدی اور دور حاضر تک جن رباعی گویوں نے اس صنف کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے ان میں میر محبوب علی خاں، میر کاظم علی برق، آزاد تو کلی، مہاراجہ سرکشن پرساد، حافظ جلیل مانک پوری، رائے منوہر لال، تسلیم گلشن آبادی، رگھونندن سکسینہ، جلال الدین توفیق، مرزا حبیب علی، عبدالقادر حسرت، محمد بہادر خاں، امجد حیدر آبادی، رشید انصاری، میر مہدی علی، صفی اونگ آبادی، محمد اسمٰعیل، جذب عالم پوری، عطا کلیانوی، میر ثامن علی نسیاں اور صاحب حیدر آبادی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

8.3.2 شمالی ہند میں اردو رباعی گوئی کا آغاز وارتقا

شمالی ہند میں ریختہ (اردو) میں شاعری کا رواج ولی دکنی کا مرہون منت ہے۔ ۱۷۰۰ء کے بعد جب ولی دیوان دہلی پہنچا تو وہاں کے شعرا جو کبھی کبھار ذائقہ بدلنے کے لیے ریختہ میں بھی اشعار کہہ لیا کرتے تھے۔ اب پوری سنجیدگی کے ساتھ ریختہ کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ انھوں نے فارسی اور دکنی اردو شاعری کے پیش نظر ریختہ یعنی اردو میں بھی مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ جن میں سے ایک رباعی بھی ہے۔ شمالی ہند کے پہلے صاحب دیوان شاعر فائز دہلوی کے یہاں کوئی رباعی نہیں ملتی لیکن شاہ ظہور الدین حاتم کے 'دیوان زادہ' مرتبہ مولوی عبدالحق میں ۳۹ رباعیاں درج ہیں۔ جن میں اکثر کے موضوع ترک دنیا ہے چند ایک رباعی عشقیہ بھی ہیں۔ بطور مثال دو رباعیات ملاحظہ ہوں:

حاتمؔ ہو جا کہیں گدائی مت کر　　ان تنگ دلوں سے آشنائی مت کر
طامع مت ہو جہاں کی نعمت اوپر　　مانند مگس کے بے حیائی مت کر

گر سوزش دل کروں کسی سے میں بیاں　　جلنے لگے تو شمع کے مانند زباں
ہے دل میں مقیم اس طرح عشقِ بتاں　　جیسے جگر سنگ میں آتش ہے نہاں

حاتمؔ کے تعلق سے بات اور بہت اہمیت کی حامل ہے کہ حاتمؔ شمالی ہند کے پہلے معلوم رباعی گو شاعر ہیں۔ حاتمؔ کے ہم عصر قائمؔ چاند پوری کے یہاں بھی کافی تعداد میں رباعیات موجود ہیں۔ میر تقی میرؔ نے اپنے تذکرہ 'نکات الشعرا' میں ان کی ایک رباعی درج کی ہے جب کہ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ان کی ۶۶ رباعیات کی نشاندہی کی ہے۔ جو ان کے مطبوعہ کلیات جلد دوم میں موجود ہیں۔ ان کی ایک رباعی بطور مثال پیش خدمت ہے:

گو عمر مری گزری ہے لوہو پیتے　　پر کیا کٹی اک دن تھے سو کیوں ہیں پیتے
تسکین ہے اب تو ہر طرح سے لیکن　　ہوتی نہ اگر موت تو کیوں کر جیتے

ان کے علاوہ اس دور میں احسن اللہ بیان میر محسنؔ برادر زادہ میر تقی میرؔ اور عبدالحی تاباںؔ کی رباعیات ملتی ہیں۔لیکن شمالی ہند میں رباعی گوئی کے لحاظ سے خواجہ میر دردؔ، میر سوزؔ، میر حسنؔ اور میر تقی میرؔ کے اسما خصوصیت کے حامل ہیں۔

خواجہ میر دردؔ اردو کے باقاعدہ پہلے اردو شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں ان کا کل کلام تصوف کے نکات و کیفیات اور سوز گداز سے معمور ہے۔دردؔ نے بڑے اہتمام کے ساتھ فارسی میں رباعیات کہی ہیں جن کی تعداد دو سو متجاوز ہے جب کہ اردو میں ان کی ۳۲ رباعیات ہی ملتی ہیں۔ یہاں ان کی دو رباعیات بطور نمونہ درج کی جارہی ہیں:

اے دردؔ یہ کون صبر کو لوٹ گیا　　یو تجھ سے جو ضبط یک بیک چھوٹ گیا
کیا تجھ پہ مصیبت پڑی ایسی ظالم　　کہہ تو سہی جی ڈہا کہ دل ٹوٹ گیا

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی　　اے دردؔ کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیاں کرے گا اس کو　　کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی

میر سوزؔ بھی اس دور کے مشہور مثنوی نگار اور غزل گو ہیں۔خواجہ میر دردؔ کے برادرِ خورد تھے۔ان کے دیوان میں بھی کچھ رباعیات ملتی ان کی ایک رباعی بطور مثال پیش کی جاتی ہے:

مخلوق ہیں اللہ کی سب خاص و عام　　کیا اہل سکوت (اور) کیا اہل کلام
پر زیست ہے ان کی جو مثال خورشید　　پیدا ہوں صبح کو تو چھپ جاویں شام

میر حسن اردو ادب میں بطور مثنوی نگار زیادہ مشہور ہیں۔ان کی تصنیف مثنوی سحر البیان اردو کا شاہکار ہے۔انھوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں رباعیات کہی ہیں۔جن میں تصوف، اخلاق، مذہب اور فلسفہ جیسے موضوعات خصوصی طور پر ملتے ہیں۔ان کی ایک رباعی بطور نمونہ پیش خدمت ہے:

ظاہر بھی تو ہے اور نہاں بھی تو ہے　　معنی بھی تو ہے اور بیاں بھی تو ہے
دونوں عالم میں تجھ سے سوا کوئی نہیں　　یاں بھی تو ہے اور وہاں بھی تو ہے

خدائے سخن میر تقی میرؔ اردو غزل میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ان کی غزل گوئی میں سوز نہانی، حزن و یاس، درد و غم اور نشتریت کا عنصر پوری طرح سے غالب ہے اور ان کی استادی کے معترف ہر خاص و عام ہے۔میر کی غزلوں کی طرح ان کی رباعیات بھی ان کے اسی اسلوب کی غمّاز ہیں۔جس میں انھوں نے اپنی زندگی

کی تلخیوں اور تجربات کو پیش کیا ہے۔ دور باعیات حسب ذیل ہیں:

دامن عزلت کا اب لیا ہے میں نے　　دل مرگ سے آشنا کیا ہے میں نے
تھا چشمۂ آب زندگانی نزدیک　　پر خاک سے اس کو بھر دیا میں نے

چپکا چپکا پھرا نہ کر تو غم سے　　کیا حرف وسخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو رہے جنوں ہوتا ہے　　اے میرؔ کوئی بات کیا کر ہم سے

مرزا محمد رفیع سوداؔ اردو میں بطور قصیدہ نگار معروف ہیں۔ قصیدہ نگاری کے علاوہ غزل گوئی اور ہجو نگاری میں بھی میں بھی انھوں نے بہت شہرت پائی۔ ان اصناف کے علاوہ انھوں نے اردو رباعی کے باب میں بھی خوب طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ ان کے کلیات میں ۸۰ رباعیات ملتی ہیں۔ یہاں ایک رباعی پیش کی جاتی ہے:

مرے خون ناحق کی دے کر گواہی　　شہادت کو میری ہے بس بیگناہی
کہا میں کہ لازم ہے قتل مرا　　لگا کہنے ہنس کر خواہی نخواہی

مرزا جعفر علی خاں حسرتؔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ جب دلی تباہ ہوئی یہ وہاں سے فیض آباد اور پھر لکھنؤ منتقل ہوئے۔ ان کا خاندانی پیشہ عطاری تھا۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں ان کی شاعری خوب چمکی اور ایک زمانے میں ان کے شاگردوں کی تعداد اس قدر ہوگئی تھی کہ وہ سب کو پہچان بھی نہیں پاتے تھے۔ اگر چہ ان کے کلام میں گہرائی و گیرائی اور کوئی اہم بات نہیں ملتی مگر زبان و بیان کا زور اور معاملہ بندی کی مہارت البتہ ظاہر ہوتی ہے۔ شیخ قلندر بخش جرات ان ہی کے شاگرد تھے اردو میں انھوں نے ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے۔ حسرتؔ کی شہرت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں رباعی کو ایک صنف کے طور پر برتا گیا ہے۔ متقدمین میں شاید ہی ایسا کوئی ہو جس نے ۵۰۰ رباعیات کہی ہوں۔ حسرت کے دیگر کلام کی طرح ان کی رباعیات بھی کیفیت کے لحاظ سے کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہیں البتہ ان کے زمانے تک کمیت میں ان کا کوئی مقابل نہیں تھا۔ ان کی رباعیات کی دوسری خوبی یہ ہے انھوں نے رباعیات پر عناوین قائم کئے ہیں۔ ان کی دور باعیات حسب ذیل ہیں:

ہرگز نہ تو وہم اور گماں میں آیا　　آیا بھی تو منھ سے نہ گیا بتلایا
ملتا نہیں تو کسی کو ملتا بھی جو ہے　　خود گم ہوا آہ جس نے تجھ کو پایا

ظاہر میں تو شکل تم دکھانے سے رہے　　اور پاس ہمیں اپنے بلانے سے رہے
یاں تک ہوئے شکل سے مری تم بیزار　　جو خواب میں بھی شکل دکھانے سے رہے

رباعی گویوں کے باب میں میر سید علی غمگینؔ دہلوی کا نام بہت اہم ہے۔ انھوں نے صنف رباعی میں

ایک دیوان بنام 'مکاشفات الاسرار' تحریر کیا جس میں ۱۸۰۰ رباعیات ہیں۔ان کے رباعیات کے موضوعات اکثر و بیشتر مذہبی ہیں جو حمد،نعت منقبت اہل بیت واصحاب رسول اور تصوف کے نکات ومباحث پر مبنی ہیں۔ان کی ایک رباعی یہاں پیش کی جاتی ہے:

کر ظاہری علم و باطنی کی بس چاہ　　یا ہونے نہ پاوے راہ سے تو گمراہ
غمگیںؔ نزدیک عالم وعارف کے　　بدتر نہیں جہل سے کوئی اور گناہ

ولی محمد نظیرؔ اکبرآبادی اردو کے پہلے عوامی ہیں جنہوں نے بادشاہوں اور امیروں کی مدح وثنا کے بجائے عوام کے مسائل ومشکلات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ایک زمانے تک ان کو روایتی شعرا اور تذکرہ نگاروں نے ان کے کلام کو معیاری ہی تسلیم نہیں کیا لیکن جب ملک کی زمام حکومت عوام کے ہاتھوں میں آئی تو نظیر کے وہ موضوعات جن کو عوامی اور سطحی گردانا جاتا تھا وہ مرکزی حیثیت کے حامل ہوگئے۔نظیرؔ نے غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ان کے کلیات میں دیگر اصناف کے ساتھ ۲۲ عدد رباعیات بھی ملتی ہیں۔ان کی ایک رباعی یہاں درج کی جاتی ہے:

ہے چاہ نے اس کی جب سے کی جا دل میں　　کیا کیا کہیئے جو ہے مہیّا دل میں
جاتی ہے جدھر نگاہ اللہ اللہ　　آتا ہے نظر عجب تماشا دل میں

غلام ہمدانی مصحفیؔ اردو شاعری کے بڑے اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔دہلی کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے لکھنؤ آ گئے اور اس کو اپنا وطن بنا لیا۔اردو غزل گوئی کے ایوان کا وہ اہم ترین ستون ہیں۔شاعری میں انھوں نے آٹھ دیوان یادگار چھوڑے ہیں جن میں دیگر اصناف سخن کے ساتھ ۱۶۴ رباعیات بھی شامل ہیں۔ان کی رباعیات کے موضوعات میں عشق،فلسفہ،اخلاق کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ایک رباعی بطور نمونہ پیش ہے:

زاہد تو ہے طاعت سے خریدارِ بہشت　　پائے جاتے ہیں اس میں آثارِ بہشت
لیکن یہ گنہگار جو ہے اے یارو!　　نہ قابل دوزخ،نہ سزاوار بہشت

قلندر بخش جرأتؔ اردو شاعری میں معاملہ بندی کے ماہر تھے۔ان کا اصلی جوہر تو غزلیہ شاعری میں نظر آتا ہے لیکن انھوں غزلوں کے علاوہ رباعی گوئی کے میدان میں بھی طبع آزمائی ہے۔ان کی رباعی بطور نمونہ پیش خدمت ہے:

ہم سے تو بتوں کی کج ادائی نہ گئی　　بو مہر کی ان میں کچھ بھی پائی نہ گئی
سو ٹکڑے کیا شیشہ دل کو لیکن　　ان سنگ دلوں سے بے وفائی نہ گئی

انشاء اللہ خاں انشاؔ اردو کے ایسے شاعر تھے جن کو زبان و بیان پر پوری مہارت حاصل تھی لیکن بدقسمتی سے انھوں نے اس کو سنجیدگی سے نہیں برتا بلکہ بذلہ سے بڑھ کر سطحیت پر اتر آئے جن نے کے فن کو بہت نقصان پہنچایا۔

انھوں نظم نثر میں طبع آزمائی کی کئی قابل قدر نمونہ اردو ادب کو دیئے۔ رباعی کے باب میں انھوں نے طنزیہ اور بے نقطہ رباعیات کہی ہیں جوان کا امتیاز ہے۔ان کی ایک رباعی یہاں پیش کی جاتی ہے:

کم ہوگا دلدّ راور دکھ کا عالم　　　　کر وورد درود کا مسلم ہردم

رکھ آس سدا کہا کر انشا اللہ　　　　اللھم ارحم ارحم ارحم ارحم

سعادت یار کار نگین کا شہرت کا باعث ان کی ریختی گوئی ہے۔ ریختی گوئی وہ اسلوب ہے جس میں عورتوں کی زبان میں کلام کیا جاتا ہے۔سعادت کو کئی زبانوں میں دستگاہ رکھتے تھے۔انھوں نے ریختی میں رباعیات بھی کہی ہیں۔ایک رباعی بطور نمونہ حاضر ہے:

رنگیں نیکی سے ہاتھ ہم نے دھویا　　　　اور تخم بدی کو کشت دل میں بویا

جو عہد کر آئے تھے وہ ہم سے نہ نبھا　　　　افسوس کہ زندگی کو یوہیں کھویا

امام بخش ناسخ لکھنؤ کے استاد شعرا میں سے ہیں اور ان کی قادرالکلامی مسلم ہے۔غزل کے علاوہ انھوں رباعیات بھی کہی ہیں ان میں عشقیہ موضوعات کو فوقیت حاصل ہے۔ایک رباعی یہاں درج کی جاتی ہے:

کب دیکھئے ہوتا ہوں دوچارِ گلشن　　　　کس دن نظر آتی ہے بہارِ گلشن

غربت نے کیا ہے خار صحرا مجھ کو　　　　تھا پیش ازیں ہائے میں خارِ گلشن

غالب اور ذوق کے دور میں رباعی گوئی:

ذوق اردو شاعری میں غزل اور قصیدہ گوئی میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔انھوں نے بھی کچھ رباعیات کہی ہیں۔ان میں سے ایک رباعی یہاں پیش کی جاتی ہے:

اس جہل کا ہے ذوق ٹھکانا کچھ بھی　　　　ہم پڑھ کے ہوئے علم، نہ دانا کچھ بھی

ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے　　　　جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

مرزا اسد اللہ خاں غالب اردو ادب با کمال شاعر ہیں جن کی شہرت چہار دانگ عالم میں ہے۔ان کی مشکل گوئی اور جدت پسندی نے تمام اہل فن سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔انھوں نے غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی اپنی مشاقی کے جوہر دکھائے ہیں۔ان کی رباعیات بھی اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ایک رباعی ملاحظہ ہو:

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں　　　　عشّاق کی پرسِش سے اسے عار نہیں

جو ہاتھ کے ظلم سے اٹھایا ہوگا　　　　کیوں کر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

مومن خاں مومن کی وجہ شہرت غزل سے ہے۔ان کی غزلوں میں مکر شاعرانہ کا استعمال بخوبی ملتا ہے۔ نیز انھوں نے اپنے تخلص کا استعمال بھی بہت معنی خیز انداز میں کیا ہے۔انھوں نے کچھ رباعیات بھی کہی ہیں۔ان

کی ایک رباعی یہاں پیش کی جاتی ہے:

ہوحق وفا ادا قضا نے چاہا　　کعبے کا سفر بخت رسا نے چاہا
ہے ترک علاج ان بتوں کا مومنؔ　　دیکھو چاہیں گے گر خدا نے چاہا

اردو کے مرثیہ گو شعرا کی رباعیاں

میر ببر علی انیسؔ اردو میں مرثیہ گو کی حیثیت سے اولیت کا مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے صنف مرثیہ کو اپنے سادہ سلیس اسلوب سے بام عروج تک پہنچا دیا۔ جہاں ایک طرف مراثی میں باکمال ہیں وہیں ان کی رباعی بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے۔غمگینؔ دہلوی کے بعد انھوں نے ہی بہت کثرت سے رباعیات کہی ہیں جن کی تعداد ۶۰۰ سے زیادہ ہے۔ان کے مجموعۂ رباعیات کو کئی اشخاص نے مرتب کیا ہے۔انیس کی رباعیات بیشتر مذہبی اور اخلاقی موضوعات برمبنی ہیں۔ان کی رثائیہ رباعیات بھی اردو ادب میں ایک نئے اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں ۔یہاں انیسؔ کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے:

دنیا میں نہ چین ایک ساعت دیکھا　　برسوں نہ کبھی روزِ فراغت دیکھا
راحت کا مکاں، امن کا گھر، خانۂ عیش　　دیکھا تو جہاں میں کُنجِ عزلت دیکھا

میر سلامت علی دبیرؔ بھی مرثیہ کے میدان میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔وہ انیس کے معاصر ہیں اور دونوں کے درمیان ادبی چشمک تھی۔دبیر کی زبان و بیان میں عالمانہ رنگ ہے اور وہ مشکل الفاظ وتعبیرات سے اپنے مرثیے کو مرصّع کرتے ہیں۔انھوں نے کثرت سے رباعیات کہی جو مجموعات کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہاں ان کی ایک رباعی پیش کی جارہی ہے:

دنیا کا جیب کارخانہ دیکھا　　کس کس کا نہ یاں ہم نے زمانہ دیکھا
برسوں رہا جن کے سر پہ چتر زریں　　تربت پہ نہ ان کت شامیانہ دیکھا

علاوہ ازیں ان دونوں کے اور بھی بہت مرثیہ گو حضرات نے رباعیات کہی ہیں جن میں عشقؔ لکھنوی، تعشقؔ لکھنوی، اوجؔ لکھنوی، میر مونسؔ، میر خورشید علی نفیسؔ، پیارے صاحب رشیدؔ، عارفؔ، میر انسؔ، عروجؔ، ندیمؔ، مانوسؔ ، واقفؔ، واصفؔ، مودبؔ لکھنوی، خبیرؔ لکھنوی، اور بہت سے شعرا شامل ہیں۔دراصل اس زمانے میں یہ رواج عام ہو گیا تھا کہ مرثیہ خوانی سے قبل لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے تمہیداً کچھ رباعیات پیش کی جاتی تھی۔اس لیے اکثر و بیشتر مرثیہ گو شعرا کے یہاں رباعیات کا بھی وافر ذخیرہ مل جاتا ہے۔جس سے اس صنف کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

8.3.3 پہلی جنگ آزادی کے بعد اردو رباعی گوئی

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کی ظالمانہ حکومت پوری

طرح سے قائم ہوگئی تو ہندوستاں میں انگریزی حکومت نے کئی سطحوں پر تبدیلیاں کرنی شروع کیں۔جن میں سب سے اہم تعلیم کا شعبہ تھا۔انگریزی حکومت نے ہندوستان میں روایتی تعلیم کو سلسلہ وار ختم کرنے اور اس کی جگہ نئی تعلیم کو جاری کرنے کی بھرپور کوشش اس سے ان کا منشا یہ تھا ہے ہندوستان میں وہ ایسے یافتہ لوگوں ایک جماعت تیار کر سکے جوان کے حکومت کے ماتحت رہ کر کام کریں لیکن شومئی قسمت کہ جدید تعلیم سے آراستہ پیراستہ ہندوستانی لوگوں میں حب الوطنی اور آزادی کا جذبہ بیدار ہونے لگا اور ایک عرصے کی جد جہد کے بعد ان ہی لوگوں ان تھک محنت وقربانی سے یہ ملک آزاد ہو پایا۔انگریزی تعلیم کے زیر اثر اردو شاعری میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ انجمن پنجاب کے تحت مشاعروں کی جگہ مجلس مناظمہ منعقد کئے جانے لگے جن میں موضوعاتی نظمیں پیش کی جاتی تھیں۔مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالؔی نے ان مناظموں میں بھرپور حصہ لیا اور اردو ادب کو ایک نئی راہ پر چلانے کی بھرپور کوشش بھی کی جس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ان دونوں حضرات نے اردو شاعری کو اس کے روایتی انداز بیان سے نکال کر اسے نئی فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کیا۔ادب کو مقامیت اور فطرت کی جانب راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس کوشش میں مولانا حالؔی نے ادب میں کئی سطحوں پر انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔نثر میں جہاں انھوں نے سوانح نگاری اور مضامین نگاری کو فروغ دیا وہیں تنقید باب میں انھوں نے اردو کو جدید تنقید سے حتی المقدور آشنا کرانے کی سعی کی۔شاعری میں انھوں نے موضوعاتی نظموں کو فروغ دیا۔ان کا مقصد اصلاح تھا اسی کے پیش نظر انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف کو برت کر اس میں جدید شاعری کے نمونے پیش کرنے کی لائق تحسین کوشش کی۔اسی جذبے کے تحت انھوں نے قوم کی فلاح بہبود کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سی رباعیات بھی کہی ہیں۔ان میں ایک رباعی یہاں بطور مثال پیش کی جارہی ہے:

جولوگ ہیں نیکوں میں مشہور بہت　　ہو نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود ایک بدی ہے گر ہو نہ خلوص　　نیکی سے بدی نہیں کچھ دور بہت

سید اکبر حسین اکبؔر الہ آبادی اردو ادب میں اپنی الگ ہی شناخت رکھتے ہیں۔وہ ایک طرف ان کی شاعری طنز ومزاح سے پر معلوم ہوتی وہیں دوسری طرح وہ اپنے اندر بڑی معنویت کی بھی حامل ہے۔اکبؔر اردو کے پہلے ایسے شاعر جنھوں نے نوآبادیاتی طرز زندگی اور فکر پر زبردست چوٹ کی ہے لیکن اردو تنقید کی یہ کمزوری رہی ہے وہ مغربی اصول وضوابط کی ایسی اندھی مقلد بنی رہی اس نے اکبؔر جیسے مصلح اور دانشور کو مسخرے سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور بلا سوچے سمجھے ان پر مغرب کے دشمن اور روایت پرست ہونے ٹھپا لگا دیا۔جب کہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے اکبر کی دیدہ وری نے ایک صدی قبل ہی وہ کچھ دیکھ لیا تھا جس کا سامنا آج پوری نوآبادیاتی دنیا کو ہے۔نوآبادیات ملکوں نے ایک صدی قبل ظاہری آزادی تو حاصل کر لی مگر وہ آج بھی فکری، تہذیبی، علمی اور

معاشی سطح پر پورب کے سرمایہ داروں اور سودخوروں کے غلام ہیں لیکن بدقسمتی سے آج بھی بہت سے نام نہاد مفکروں کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔ جب کہ اکبرؔ انھیں ایک صدی قبل اس غارت گری سے آگاہ کر چکے تھے۔ ان کی اس رباعی میں یہی پیغام ملتا ہے:

نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زباں — مطلب یہ ہے کہ سمجھے ان کے فرماں
مقصود نہیں میاں کی سی عقل و تمیز — اس نکتہ کو کیا وہ سمجھیں جو ہیں ناداں

بیسویں صدی میں اردو رباعی

شادؔ عظیم آبادی شہر پٹنہ کے معروف شاعر تھے اور اساتذۂ فن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انھوں شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جن میں سے ایک رباعی بھی ہے۔ ان کی رباعیات کے بیشتر مضامین تصوف، فلسفہ اور اخلاق سے متعلق ہیں۔ یہاں ان کی ایک رباعی پیش کی جارہی ہے:

حرماں کے سوا ہاتھ نہ کچھ آئے گا — حسرت لے کر تو جس طرف جائے گا
ہر سانس نکل نکل کر یوں کہتی ہے — غافل اب چیت ورنہ پچھتائے گا

امیرؔ مینائی اردو غزل گوئی میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں غزلوں کے علاوہ ۳۰ عدد رباعیات بھی کہی ہیں۔ ان کی ایک رباعی یہاں درج کی جاتی ہے:

مشکل سے تجھے او گل رعنا پایا — کونین میں پھر کر ترا کو چا پایا
دنیا عقبیٰ سے عاشقی حاصل کی — صغرا کبرا سے یہ نتیجا پایا

جگت موہن لال رواںؔ سیتا پور کے رہنے والے تھے۔ پیشے سے وکیل تھے اور شاعری میں عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اردو شاعری میں فکری، سماجی اور تہذیبی موضوعات کو بخوبی برتا ہے۔ ان کی رباعیات فلسفیانہ موضوع سے مملو ہیں۔ یہاں ان کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے:

حرص و ہوس حیات فانی نہ گئی — اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگ مزار پر ترا نام رواںؔ — مر کر بھی امید زندگانی نہ گئی

عبدالباری آسیؔ کی رباعیات ان کے مجموعہ 'بصائر' میں شامل ہیں۔ جن عشق، اخلاق، فلسفہ اور مذہب کے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ یہاں ان کی ایک رباعی درج کی جاتی ہے:

قبل اس کے کہ زندگی کا برہم ہو نظام — وہ کام کرو کہ ہو نہ خفت انجام
جس کام کو کل پر ٹالتے رہتے ہو — شاید کہ نہ کر سکو گے کل تم وہ کام

محمد ظہیر احسن المعروف علامہ شوقؔ نیموی اپنے زمانے مشاہیر علم و فن میں ہیں۔ معقولات و منقولات میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ علم حدیث اور فقہ حنفی کی تائید میں آپ نے معرکۃ آرا کتابیں تحریر فرمائیں۔ آپ شاعری کا

ستھرا ذوق رکھتے تھے۔اصناف شاعری میں آپ نے غزل،مثنوی،قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں۔یہاں ان کی ایک رباعی درج کی جاتی ہے:

گھائل جو ہوں تیغ ابرو دلبر کا ہر لفظ میں رنگ ہے دم خنجر کا
ٹوٹے ہوئے دل سے جو صدا نکلے گی اے شوقؔ کرے گی کام وہ نشتر کا

یاسؔ یگانہ چنگیزی شہر عظیم آباد کے تھے لکھنؤ ان کا وطن ثانی تھا۔شاعری اور عروض پر ان کو کامل دستگاہ حاصل تھی۔انھوں نے غزلوں کے علاوہ رباعی بھی کہی ہیں۔یہاں ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

دل کو حد سے سوا دھڑکنے نہ دیا قالب میں روح کو پھڑکنے نہ دیا
کیا آگ تھی سینے میں جسے فطرت نے روشن تو کیا مگر بھڑکنے نہ دیا

تلوک چند محرومؔ اردو مایہ ناز شاعروں سے ہیں۔مناظر فطرت کی تصویر کسی میں انھیں مہارت حاصل تھی۔انھوں ہر مذہب کے پیشوائے کو اپنی شاعری کے ذریعہ خراج تحسین پیش کیا ہے جو ان کے صلح کل کی غماز ہے۔انھوں کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی ہے خصوصاً غزلوں اور نظموں انھوں نے اپنے مہارت فن کا ثبوت فراہم کیا ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے رباعیات بھی کہی ہیں۔یہاں ان کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے:

زندہ ہیں تری رضا پہ مرنے والے یہ ڈوب کے ہیں پار اترنے والے
بے خوف وہی، ہیں جن کو ہے خوف ترا کسی سے ڈرتے ہیں، تجھ سے ڈرنے والے

جعفر علی خاں اثرؔ لکھنؤ کے مشہور شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ان کو لکھنوی زبان و بیان پر کامل دسترس حاصل تھے۔رباعیات میں ان کا ایک مجموعہ 'لالہ وگل' کے نام سے مطبوع ہے جس میں عشق، فلسفہ، تصوف اور اخلاق پر رباعیات ہیں۔یہاں بطور نمونہ ایک رباعی پیش کی جاتی ہے:

لطف و کرم جور ستم بھول گئے عیش طرب رنج والم بھول گئے
اس عشق نے بیگانہ کیا سب سے اثرؔ ایک خواب تھا جو دیکھ کے ہم بھول گئے

جوشؔ ملیح آبادی اردو کے ایسے شاعر ہیں جو ادب میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔شوکت الفاظ، بلند لب و لہجے اور انقلابی فکر کی وجہ ان کو شاعر انقلاب کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔انھوں نے کثرت کے ساتھ رباعیات بھی کہی ہیں جو دو مجموعات کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔یہاں ان کی ایک رباعی درج کی جاتی ہے:

آلام سے ہے نجات میرے دل کو چھوتی نہیں کائنات میرے دل کو
رہتا ہے جو پردۂ تغافل میں نہاں حاصل ہے وہ التفات میرے دل کو

رگھو پتی سہائے فراقؔ گورکھپوری اردو میں اپنے منفرد انداز بیان کے لیے معروف ہیں۔غزل کے ساتھ ساتھ انھوں نے رباعی گوئی کے فن میں بھی اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ان کی رباعیات کا مجموعہ 'روپ' کے نام

سے شائع ہوا ہے۔فراق کی رباعیات کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اس میں ہندوستانی تہذیب اور معاشرے کو بڑی مشّاقی کے ساتھ بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں ان کی ایک رباعی پیش کی جارہی ہے:

ہونٹوں پہ پیام لطف آنے بھی نہ دے　　دم بھر کو حجاب ناز اٹھانے بھی نہ دے
یہ عشق حزیں پہ مہربانی کیسی　　جو حسن کو کھل کر مسکرانے بھی دے

صمد یار خاں ساغرؔ نظامی کی رباعیات کا مجموعہ شبابیات کے نام سے شائع ہوا اور ان کے ایک دوسرے مجموعۂ نظم 'بادۂ مشرق' میں بھی ک ۵۴/رباعیات موجود ہیں۔شبابیات میں انھوں بے شباب (جوانی) کو موضوع بناتے ہوئے انھوں نے ۶۸ رباعیات کہی ہیں۔ یہاں ان کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے:

ادراک سے بالا ہے کہانی میری　　نا قابل حل ہے زندگانی میری
دل فلسفۂ سرور وغم ہے ساغرؔ　　اور فلسفۂ دل ہے جوانی میری

خواجہ عبد السمیع پال اثرؔ صہبائی (۱۹۰۱ء۔۱۹۶۳ء) اردو میں ممتاز رباعی گویوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔وہ فلسفہ سے ایم۔اے تھے۔ان کی رباعیات میں فلسفیانہ خیالات کی کثرت ملتی ہے۔ یہاں بطور نمونہ ان کی ایک رباعی درج کی جاتی ہے:

ایک ہی مے جام کتنے ہیں　　اک حقیقت کے نام کتنے ہیں
موت بھی عشق کا ہے ایک مقام　　ابھی جانے مقام کتنے ہیں

سید ریاض احمد خیر آبادی ریاضؔ (۱۸۵۳ء۔۱۹۳۴ء) اردو ادب میں خمریات کے امام مانے جاتے ہیں۔ان کی شاعری میں شوخی اور حسن پرستی کا عنصر غالب ہے۔ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

کل تک کوئی تھا نہ مے کا قطرا گھر میں　　پانی سے کھلا، کھلا جو روزا گھر میں
ساقی کی نگاہ لطف تھی جو عید کے دن　　بہتے نظر آئے مے کے دریا گھر میں

اردو کے نئے شعرا نے رباعی کے فن کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔اس کی وجہ یہ کہ رباعی گوئی کے لوازمات کی پابندی مشکل عمل ہے۔رباعی کے فن میں وہی شاعر کامیاب ہوسکتا ہے جس فن، موضوع اور زبان و بیان پر پوری گرفت حاصل ہو اور ایسی مہارت ایک عرصے کی مشق وممارست بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔اس لئے اکثر شعرا اس وادیٔ پرخار سے بچ کر ہی نکل جانے میں عافیت سمجھتے ہیں لیکن جدید شعرا میں بھی ایک لوگوں کی کمی نہیں ہے جنھوں نے اس قدیم صنف کو نئے لب و لہجے میں برت کر نہ صرف دکھایا ہے بلکہ اس میں لائق تحسین اضافے بھی کئے ہیں۔ذیل میں چند ایسے ہی شعرا کا تذکرہ کیا جارہا ہے جنھوں نے رباعی کے فن میں قابل قدر اضافے کئے ہیں۔

سید شمیم الدین حیدر (۱۹۱۳ء۔۱۹۷۵ء) شمیم کرہانی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایک معروف شاعر ہیں ۔انھوں نے غزل ،نظم مرثیہ اور رباعی کی صنف میں طبع آزمائی ہے ۔ان کی رباعیات عشق، وطن، زندگی، علم و اخلاق وغیرہ کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ایک رباعی یہاں درج کی جاتی ہے:

ہستی کے مسائل کو جو سلجھاتا ہوں　　صد حلقۂ اوہام میں گھر جاتا ہوں
کیا چیز ہے زندگی کی الجھن یاروں　　تم بیٹھ کے سوچوں میں ابھی آتا ہوں

ڈاکٹر سلام سندیلوی اردو رباعیات کے بڑے محققین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ان کا تحقیقی مقالہ بھی اسی صنف پر سند کی حیثیت رکھتا ہے۔جس میں انھوں نے رباعی کے فن کو بخوبی واضح کیا ہے۔وہ خود بھی ایک رباعی گو تھے۔ان کی رباعیات کا مجموعہ 'شام وشفق' کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں تاریخ اشخاص واقعات کو رباعی کا موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں ان کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے:

وہ اجلی اجلی ندی، وہ کالی برسات　　پھولوں کو لئے ہوے وہ بہتا ہوا پات
یا جارہی ہے سرجو میں اک کشتی پر　　دشرتھ کی بہ صد ناز ونزاکت بارات

پریم وار برنٹی (۱۹۳۰ء۔۱۹۷۹) ریاست پنجاب سے شہر مالیر کوٹلہ کے رہنے والے تھے۔ان کا خاندان مغربی پنجاب سے ہجرت کر کے یہاں سکونت پذیر ہوا تھا۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا افسانے سے کی پھر وہ شاعری کی طرف بھی متوجہ ہوئے انھوں نے صنف میں شاعری میں نظمیں،غزلیں،قطعات کے علاوہ رباعیات بھی کہی ہیں جن میں ہندوستانی رنگ غالب ہے۔زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ان کا لب ولہجہ ہندی مائل اردو ہے جو بہت ہی شیریں اور دلپذیر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ان کی ایک رباعی پیش کی جارہی ہے:

جب بھی ٹھنڈی ہوا سنگتی ہے　　جب بھی پتہ کوئی کھڑکتا ہے
میری تنہائیوں کے سینے میں　　تیری یادوں کا دل دھڑکتا ہے

اختر علی رحمت صہبا (۱۹۳۱ء۔۱۹۹۶ء) اردو کے جدید شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ۔انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی ہے۔حمد،نعت،منقبت،نظم،گیت،قطعات کے علاوہ انھوں نے رباعیات بھی کہی ہیں۔ یہاں بطور نمونہ ایک رباعی درج کی جاتی ہے:

انفاس میں کلیوں کی مہک لے آیا　　احساس میں شیشوں کی کھنک لے آیا
کیا باتیں ہوئیں ان سے مجھے یاد نہیں　　جو پھول گرے ان کی مہک لے آیا

سلیمان اریب (۱۹۲۲ء) حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے۔انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز نثر نگاری سے کیا مگر وہ پھر پوری طرح سے شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔انھوں نے کئی رسائل کی ادارت بھی کی۔ انھوں نے شاعری کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جن میں سے ایک رباعی بھی ہے۔ یہاں ان کی ایک رباعی

درج کی جارہی ہے:

بے دامن و با دیدۂ تر زندہ ہوں　　آئینہ بکف خاک زندہ ہوں
مجھ زندِ خرابات کو دیکھ اے دنیا　　ہر سانس پہ مرتا ہوں مگر زندہ ہوں

طلحہ رضوی برقؔ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کا تعلق عظیم آباد (پٹنہ) سے ہے۔ وہ فارسی اردو اور عربی زبان پر کامل مہارت رکھتے ہیں۔ ادب اور تصوف سے ان کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ انھوں نے شاعری کی اکثر اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا کلام علمیت کے ساتھ ساتھ جاذبیت کا مرقع ہے۔ شباب سخن کے نام سے ان کی رباعیات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ یہاں ایک رباعی بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے:

فکر اپنی جو انداز بدل جاتی ہے　　الفاظ کے پیمانے میں ڈھل جاتی ہے
دیکھو تو ذرا گرمیٔ احساسِ وفا　　لو دیتی ہوئی شمع پگھل جاتی ہے

شمس الرحمان فاروقی (۱۹۳۵ء۔۲۰۲۰ء) شمس الرحمان فاروقی اردو ادب کے مایہ ناز تنقید نگار ہیں۔ تنقید کے ساتھ انھوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی ہے ان کا کلیات شائع ہو چکا ہے۔ یہاں ان کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے:

تاریک رگیں لہو سے روشن کر دے　　شادابی زر کو زیب دامن کر دے
اے شمعِ فروزاں پس لوح سحری　　بادل آنکھوں کو برق مسکن کر دے

مندرجہ ذیل بالا صفحات میں اردو رباعی کے آغاز و ارتقا کا ایک اجمالی خاکہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صفحات کی تنگی کے باعث بہت سے رباعی گویوں کے ناموں سے صرف نظر کرنی پڑی ہے لیکن یہ پوری کوشش کی گئی ہے کہ تمام معروف ناموں کو حتی المقدور پیش کر دیا جائے تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ رباعی گوئی کا فن عہد بہ عہد کس طرح ترقی کرتا رہا ہے اور آج وہ کہاں ہے۔ رباعی گوئی کے فن میں اپنی ابتدا سے آج تک موضوعات کے لحاظ سے بہت سے اضافے ہوئے ہیں۔ مگر رباعی گوئی میں اختصار کے ساتھ ساتھ عروضی پابندیوں کی وجہ سے اکثر شعرا اس سے دور ہی رہتے ہیں۔ اس کے باوجود رباعی کا فن اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ اور ترقی کر رہا ہے۔ اردو کے ان تمام شعرا کے یہاں جو عروضی پابندی کے ساتھ شاعری کرتے ہیں اگر ان سب کی رباعی گوئی کو اجمالی طور پر بھی بیان کرنے کی جسارت کی جائے تو بھی کئی ہزار صفحات ان کے فن کو پیش کرنے کے لئے ناکافی ہوں گے۔

8.4 خلاصہ

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جو 'ربع' سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں 'چار والا'۔ اصطلاح میں رباعی اس اس مختصر نظم کو کہتے ہیں جس میں چار مصرعے ہوں اور اس میں مخصوص اوزان کی پابندی کی جائے۔ فارسی میں رباعی

کے موجد کے سلسلے میں محققین کا اختلاف ہے۔لیکن اردو میں پہلا رباعی گو محمد قلی قطب شاہ کو مانا جاتا ہے۔ان کے ہم عصر ملا وجہی کے یہاں بھی رباعیات ملتی ہیں۔ان کے بعد دکن میں رباعی گویوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جن میں اہم ترین شعرا غواصی، علی عادل شاہ ثانی شاہی، نصرتی، فیروزی، میراں یعقوب، بابا شاہ حسینی، جانم ثانی، پیر باشا حسینی، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، عبدالقادر حیدرآبادی، پروانہ، شاہ عظیم، شہ میر، عزلت، مفتوں، عشق، آزاد، عبرت، تمنا، آگاہ اور شاہ کمال وغیرہ کے اسما قابل ذکر ہیں۔پھر انیسویں صدی اور دور حاضر تک جن رباعی گویوں نے اس صنف کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے ان میں میر محبوب علی خاں، میر کاظم علی برق، آزاد توکلی، مہاراجہ سرکشن پرساد، حافظ جلیل مانک پوری، رائے منوہر لال تسلیم گلشن آبادی، رگھونندن سکسینہ، جلال الدین توفیق، مرزا حبیب علی، عبدالقادر حسرت، محمد بہادر خاں، امجد حیدرآبادی، رشید انصاری، میر مہدی علی، صفی اونگ آبادی، محمد اسمٰعیل، جذب عالم پوری، عطا کلیانوی، میر ثامن علی نسیاں اور صاحب حیدرآبادی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔شمالی ہند کے پہلے رباعی گو شاہ حاتم ہیں ان کے بعد قائم چاند پوری کے یہاں بھی بڑی تعداد میں رباعیات ملتی ہیں۔اس دور میں خواجہ میر درد، میر سوز، میرزا سودا، میر تقی میر، میر حسن وغیرہ نے اس صنف کو خوب فروغ دیا۔دیگر رباعی گویوں میں حسرت دہلوی، غمگین دہلوی، مصحفی، راسخ، وحشت، عبدالحی تاباں، احسن اللہ خاں بیان، اشرف علی فغاں، تسلیم، عزیز وغیرہ نے عمدہ رباعیات کہی ہیں۔پھر لکھنؤ میں انشاء اللہ خاں انشاء، سعادت یار خاں رنگین، ناسخ وغیرہ نے بھی اس صنف میں تھوڑا بہت اضافہ کیا ہے۔ان شعرا کے برعکس جرأت نے رباعیات پر خصوصی توجہ کی ہے۔نظیر اکبرآبادی نے بھی عمدہ رباعیات کہی ہیں۔شمالی ہند میں غالب، مومن کے دور میں اس صنف کو کافی اہمیت دی گئی۔غالب، مومن، ذوق اور بہادر شاہ ظفر نے رباعیات کے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ لکھنؤ میں مرثیہ گویوں نے اس صنف پر خصوصی توجہ صرف کی انیس و دبیر نے اس صنف کو بام عروج تک پہنچا دیا۔جدید دور میں مولانا حالی، اکبرالہ آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، میر مہدی مجروح، شاد عظیم آبادی، علامہ شوق نیموی، امیر مینائی، جلیل مانکپوری، پیارے صاحب رشید جیسے شعرا نے اس صنف میں قابل قدر نمونے پیش کئے ہیں۔ علاوہ ازیں داغ دہلوی، ریاض خیرآبادی، سرور جہاں آبادی، نظم طباطبائی، شوق قدوائی، عزیز لکھنوی نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔آزادی سے پہلے فانی بدایونی، جوش، امجد، فراق، رواں، محروم اور یگانہ وغیرہ نے اس کو خصوصیت کے ساتھ برتا اور رباعی کی صنف کو از سر نو زندہ و تابندہ کر دیا۔اس کے بعد سیماب اکبرآبادی، عبد الباری آسی اور اثر لکھنوی کا نام اہم ہے۔ان کے علاوہ اخگر مرادآبادی، رگھوپندر راؤ جذب، رشید لکھنوی، علامہ اقبال، اختر شیرانی، آرزو لکھنوی، وحشت کلکتوی، خواجہ دل محمد، پرویز شاہدی، ساغر نظامی، اثر صہبائی، شمیم کرہانی، منیر شکوہ آبادی، مہاراجہ سرکشن پرشاد، ڈاکٹر آر آر سکسینہ، جمیل مظہری، صفیہ شمیم، نریش کمار شاد، اختر انصاری، وحشی کانپوری، شنا گورکھپوری، جواہر ناتھ ساقی، عبدالرحمن احسان، شوکت پردیسی، سلیمان اریب، ناوک

حمزہ پوری، طلحہ رضوی برقؔ، قتیل شفائی، پریم وار برٹنی،صہبا اختر،عبد العزیز خالدؔ،نامی انصاری،باقر مہدی،صادقین،امیر چند بہار،سید محمود الغفار، غلام مولیٰ قلق،بیان میرٹھی،فرحت کانپوری،منظور حسین شورؔ،شمس الرحمٰن فاروقی،فرید پربتی،اکبر حیدر آبادی،نذیر بنارسی،شیدا انبالوی،قاسم علی خاں آفریدی، ف۔س۔اعجاز، کندن لال کندن،حافظ کرناٹکی،صابر سنبھلی، جمال اویسی،عبید الرحمٰن اور علقمہ شبلی وغیرہ کے نام اردو رباعی گویوں میں قابل قدر ہیں۔اردو شاعری کی ابتدا سے زمانہ حاضر تک کے شعرا کی یہ ایک مختصر سی فہرست ہے جس سے یہ اندازہ لگ جاتا ہے کہ صنف رباعی ہر زمانے میں اردو کی مقبول صنف رہی ہے گرچہ اس راہ میں نشیب و فراز آتے رہے ہیں مگر اس کی اہمیت میں کبھی کمی نہیں آئی ہے۔آج بھی بہت سے شعرا اس صنف میں طبع آزمائی کر رہے کو اس کی مقبولیت اور استحکام کی بین دلیل ہے۔

8.5 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ کو

رباعی کے فن اور اس کے ابتدا و ارتقا سے واقفیت حاصل ہوئی۔

دکن میں رباعی گوئی کے آغاز ارتقا کا خاکہ سامنے آیا۔

دکن کے اہم رباعی گویوں سے واقفیت حاصل ہوئی اور ان کی رباعیات کے امتیاز کو سمجھا۔

شمالی ہند میں رباعی گوئی کے آغاز و ارتقا سے واقفیت حاصل ہوئی۔

شمالی ہند کے معروف رباعی گویوں کی رباعیات اور ان کے کلام کے امتیازات کو سمجھا۔

8.6 اپنا امتحان خود کریں

1. اردو کا پہلا رباعی گو شاعر کون ہے؟
2. محمد قلی قطب شاہ کی رباعی گوئی پر مختصر نوٹ لکھیں؟
3. دکن کے کچھ مشہور رباعی گو شعرا کے نام بتائیں؟
4. شمالی ہند کا پہلا رباعی گو کون ہے؟
5. اکبر کی رباعی گوئی پر ایک مختصر نوٹ لکھیں؟

8.7 سوالات کے جوابات

1. اردو کے پہلے رباعی گو شاعر اب تک کی تحقیق کے مطابق محمد قلی قطب شاہ ہیں۔اس لئے کہ ان کا کلام محقّق انداز میں مرتب ہو چکا ہے اور اب تک کی تحقیق میں ان سے قبل کسی کی بھی رباعیات حاصل نہیں ہو سکی ہیں ۔جن محققین نے دیگر لوگوں کے بعض کلام کے بنا پر قیاس آرائیاں کی ہیں وہ تحقیق کے باب میں قابل قبول نہیں ہیں۔اس لئے اردو کے پہلے رباعی گو محمد قلی شاہ ہی قرار پاتے ہیں۔

2. محمد قلی قطب شاہ کی رباعیات کے موضوعات گوناں گوں اور متنوع ہیں۔ وہ بنیادی طور پر حسن و عشق کے شاعر تھے چنانچہ ان کی دیگر اصناف شاعری کی طرح ان کی رباعیات بھی خصوصیت کے ساتھ حسن و عشق کا مرقع ہیں۔ عشقیہ موضوعات کے علاوہ ان کے یہاں مذہبی موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے مذہبی موضوعات کے تحت حمد، نعت اور منقبت کہی ہیں اسی طرح دنیا کی بے ثباتی اور تصوف سے متعلق بھی بعض رباعیات پائی جاتی ہیں لیکن ان کی رباعی گوئی کا سارا جوہر عشقیہ رباعیات میں ہی کھلتا ہے اور یہی ان کا امتیاز بھی ہے کہ انھوں نے فارسی مثنوی کے برعکس اخلاقی اور فلسفیانہ موضوع کو کم اہمیت دی ہے اور عشقیہ موضوع کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اردو میں رباعی گوئی کا یہ ابتدائی تجربہ تھا اس لیے ان کی بعض رباعیات ناہمواری کا شکار نظر آتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی کچھ رباعیات بہت ہی سلیس اور رواں بھی ہیں۔ قلی قطب شاہ کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

تج حسن تھے تازہ ہے سدا حسن و جمال　　تجھ یاد کی مستی اہے عشق کوں حال
توں ایک ہے تجسا نہیں دوجا کہیں　　کیوں پاوے جگت صفحے میں کوئی تیرا مثال

3. قلی قطب شاہ غواصی، نصرتی، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، عبدالقادر حیدرآبادی، ملا وجہی، علی عادل شاہ ثانی، فیروزی، میراں جی خدانما منشی، میراں یعقوب، گوہری، بابا شاہ حسینی، جانم ثانی، پیر باشا حسینی، پروانہ، شاہ عظیم، شہ میر، عزلت، مفتوں، عشق، آزاد، عبرت، تمنّا، آگاہ اور شاہ کمال۔ پھر انیسویں صدی اور دور حاضر تک جن رباعی گویوں نے اس صنف کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے ان میں میر محبوب علی خاں، میر کاظم علی برق، آزاد تو کلی، مہاراجہ سرکشن پرساد، حافظ جلیل مانک پوری، راے منوہر لال تسلیم گلشن آبادی، رگھونندن سکسینہ، جلال الدین توفیق، مرزا حبیب علی، عبدالقادر حسرت، محمد بہادر خاں، امجد حیدرآبادی، رشید انصاری، میر مہدی علی، صفی اورنگ آبادی، محمد اسمٰعیل، جذب عالم پوری، عطا کلیانوی، میر ثامن علی نسیاں اور صاحب حیدرآبادی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

4. شمالی ہند کے پہلے رباعی گو شاعر حاتم ہیں۔ مسعود حسین رضوی ادیب کے مرتبہ دیوان فائز دہلوی میں کوئی رباعی موجود نہیں ہے۔ اس بنا پر شاہ ظہور الدین حاتم کو رباعی کے باب میں ایک گونہ سبقت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ دیوان زادہ (دیوان حاتم) سے پہلے فائز نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا مگر اس میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے حاتم شمال کے پہلے رباعی گو جبکہ فائز پہلے صاحب دیوان شاعر قرار پاتے ہیں۔

5. سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی اردو ادب میں اپنی الگ ہی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ ایک طرف ان کی شاعری طنز و مزاح سے پر معلوم ہوتی وہیں دوسری طرح وہ اپنے اندر بڑی معنویت کی بھی حامل ہے۔ اکبر اردو کے پہلے ایسے شاعر جنھوں نے نو آبادیاتی طرز زندگی اور فکر پر زبردست چوٹ کی ہے لیکن اردو تنقید کی یہ کمزوری رہی

ہے وہ مغربی اصول وضوابط کی ایسی اندھی مقلد بنی رہی اس نے اکبر جیسے مصلح اور دانشور کو مسخرے سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور بلا سوچے سمجھے ان پر مغرب کے دشمن اور روایت پرست ہونے ٹھپا لگا دیا۔ جب کہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے اکبر کی دیدہ وری نے ایک صدی قبل ہی وہ کچھ دیکھ لیا تھا جس کا سامنا آج پوری نوآبادیاتی دنیا کو ہے۔ نوآبادیات ملکوں نے ایک صدی قبل ظاہری آزادی تو حاصل کر لی مگر وہ آج بھی فکری، تہذیبی، علمی اور معاشی سطح پر پورب کے سرمایہ داروں اور سود خوروں کے غلام ہیں لیکن بدقسمتی سے آج بھی بہت سے نام نہاد مفکروں کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔ جب کہ اکبر انھیں ایک صدی قبل اس غارت گری سے آگاہ کر چکے تھے۔ ان کی اس رباعی میں یہی پیغام ملتا ہے:

نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زباں — مطلب یہ ہے کہ سمجھے ان کے فرماں
مقصود نہیں میاں کی سی عقل وتمیز — اس نکتہ کو کیا وہ سمجھیں جو ہیں ناداں

8.9 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
مستعار	ادھار، کسی سے لینا
مِنْ وعَنْ	ہو بہو، کسی بات بالکل اسی طرح کہنا
خطہ	حصہ، علاقہ
مُحَقَّق	تحقیق شدہ، جانچا پرکھا ہوا
برعکس	الٹا، مخالف
خمّار	شراب بیچنے والا
وافی	کافی
سیس	سر
مسجود	جس کو سجدہ کیا جائے، خدا،
مرہون مِنّت	احسان مند ہونا
چشمک	لڑائی، مباحثہ

8.10 کتب برائے مطالعہ

1. اردو رباعیات — ڈاکٹر سلام سندیلوی
2. اردو رباعی (فنی وتاریخی ارتقا) — ڈاکٹر فرمان فتح پوری
3. رباعی ایک عروضی مطالعہ — پروفیسر عظیم الرحمن

4. تنقید رباعی ڈاکٹر فرید پربتی

5. مقدمہ صنف رباعی ڈاکٹر فرید پربتی

اکائی 9. حالی حیات اور رباعی گوئی

ساخت

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 حالی: حیات اور رباعی گوئی

9.3.1 حالی: سوانحی کوائف

9.3.2 حالی کی رباعی گوئی

9.3.3 حالی کی رباعیات کا تجزیہ

9.3.4 خلاصہ

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

9.5 اپنا امتحان خود لیجئے

9.6 سوالات کے جوابات

9.7 کلیدی الفاظ

9.8 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ

حالی کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کریں گے۔

حالی کی رباعی نگاری سے متارف ہوں گے۔

حالی کے رباعیات کا تجزیہ کر کے اسے سمجھیں گے۔

9.2 تمہید

طلبائے گرامی! گزشتہ اکائیوں میں آپ نے رباعی کی تعریف اس کی فنی خصوصیات اس کی روایات، اس کے موضوعات، اس کے آغاز وارتقا اور نمائندہ رباعی گویوں سے واقف ہوئے۔ اب اس اکائی میں آپ مولانا الطاف حسین حالی کے سوانحی کوائف سے آشنا ہوں گے اور ان کی رباعی گوئی سے بحث کریں گے۔ ان کی رباعیات

کے امتیازات کو سمجھیں گے۔

9.3 حالی: حیات اور رباعی گوئی

9.3.1 حالی: سوانحی کوائف

حالی کا اصل نام خواجہ الطاف حسین تھا اور حالؔی ان کا تخلص تھا۔ ان کے اجداد غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ہرات سے ہندوستان آ کر آباد ہوئے تھے۔ یہ خاندان شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری پیر ہرات کی اولاد میں تھا۔ ایسی خاندان کے ایک شخص خواجہ ملک علی جو اپنے زمانے کے ممتاز عالم دین تھے وہ سرزمیں ہرات سے ہندوستان آئے اور انھیں حکومت کی طرف پانی پت کا قاضی متعین کیا گیا اور اسی کے قریب گاؤں میں انھیں جائداد بھی دی گئی۔ اسی خاندان میں حالی کی پیدائش ۱۸۳۷ء میں ہوئی۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش تھے۔ خواجہ ایزد بخش کی چار اولادیں تھیں جن میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ حالی اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

حالی کی ابتدائی تعلیم چار سال کی عمر میں شروع ہوئی اور اولاً انھوں قرآن پاک حفظ کیا۔ اس کے بعد انھیں فارسی سیکھنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ انھوں نے سید جعفر علی فارسی زبان کی تعلیم لی۔ فارسی کے بعد انھوں نے عربی حاجی ابراھیم حسین سے سیکھی پھر انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ نو سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے ان کی رسمی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن وہ برابر علم کی جستجو میں لگے رہے انھوں نے مختلف علما کی صحبت اختیار کی اور ساتھ ہی ساتھ مطالعہ سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔

اس زمانے میں ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے ان کی پوری کفالت کی۔ جب حالی سترہ برس کے ہوئے تو ان کے گھر والوں نے ان کی شادی کر دی لیکن حالی کو تو علم حاصل کرنے کا سودا سمایا ہوا تھا چنانچہ اس شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ایک دن کسی کو مطلع کئے بغیر گھر سے دلی کی جانب نکل پڑے اور وہاں جامع مسجد سے ملحق مدرسہ حسین بخش میں داخلہ لے لیا۔ جہاں انھوں نے مولوی نوازش علی سے درس لیا نیز انھوں نے دیگر علما سے بھی استفادہ کیا جن میں مولوی فضل حسن، مولوی امیر احمد اور میاں نذیر حسین کا م سرفہرست ہے۔ اس دوران انھوں نے دلی کے بہت سے علما، فضلا، ادبا اور شعرا سے ملاقاتیں بھی کیں اور ان کی صحبت سے مستفید بھی ہوئے جن میں غالبؔ بھی شامل ہیں۔ غالب کی شاعری سے حالؔی بہت متاثر ہوئے اور ان کے اثرات حالؔی پر تا عمر رہے۔

حالؔی کو ابھی دلی آئے ڈیڑھ سال ہی ہوئے تھے کہ ان کے گھر والوں کو ان کی خبر مل گئی چنانچہ ان کے اصرار پر انھیں دوبارہ پانی پت لوٹنا پڑا۔ لیکن حالی نے مطالعہ جاری رکھا مگر انھیں اب تلاش معاش کی بھی فکر کرنی پڑ رہی تھی۔ بسیار تلاش کے بعد آخر کار انھیں ۱۸۵۶ء میں حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ایک نوکری مل گئی چنانچہ وہ پانی پت سے حصار منتقل ہو گئے۔ لیکن ابھی انھوں نے راحت کی سانس ہی لی تھی کہ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی

تحریک شروع ہوگئی حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ ایک بار پھر پانی پت واپس آ گئے اور وہ مسلسل چار سال تک پانی پت میں رہے۔انھوں نے اپنے اس قیام کے دوران پورے انہماک کے ساتھ علم کا حصول جاری رکھا انھوں نے علم التفسیر،علم الحدیث اور منطق وفلسفہ جیسے علوم عالیہ وآلیہ حاصل کئے۔

۱۸۵۷ء کی خوں چکاں ہنگامہ آرائی کے بعد جب حالات سازگار ہوئے تو حالی دوبارہ دلی واپس لوٹے اور علمی محافلوں اور مباحثوں میں حصہ لینے لگے جس سے اہل علم میں ان شخصیت متعارف ہوئی اور ان کا رابطہ نواب مصطفیٰ علی خاں شیفتہ سے ہوا جو دہلی کے قریب جہانگیر آباد ریاست کے ایک بڑے رئیس تھے۔وہ حالؔی کے علم و فضل سے متاثر تھے لہٰذا انھیں نے حالؔی کو اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔اس سے حالی کو دو طرح کے فوائد حاصل ہوئے ایک تو ان کی معاشی ضرورت پوری ہوگئی نیز شیفتہ جیسے استاد سے انھیں تقریباً دس سال تک کسب فیض کی سعادت بھی حاصل ہوئی اور اسی صحبت کا اثر تھا کہ حالؔی فائدہ منداور اصلاح پسند ادب کے قائل ہو گئے۔حالؔی کو غالبؔ کی بھی صحبت حاصل رہی لیکن ان پر زیادہ اثر شیفتہ کا ہی نظر آتا ہے۔۱۸۷۲ء میں جب شیفتہ کی وفات ہوئی تو حالی دہلی سے لاہور کی جانب منتقل ہو گئے یہاں انھیں پنجاب بک ڈپو انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کی تصحیح کی ذمیداری دی گئی جس سے حالؔی کو انگریزی ادب سے بھی خاطر خواہ واقفیت حاصل ہوئی جس سے ان کی فکر میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوگیا اب وہ پوری طرح سے افادی ادب کے مبلغ بن گئے۔انجمن پنجاب کے مناظموں نے انھوں نے برکھارت،نشاط امید،حب وطن،مناظرۂ رحم وانصاف کے عناوین سے نظمیں پیش کیں۔ قیام لاہور کے دووان ہی انھوں نے قصہ کے پیرائے میں 'مجالس النساء' کے نام سے بچیوں کے لئے اخلاقی حکایات تحریر کیں۔جس پر ان کو وائسرائے نے ۴۰۰ روپے کا انعام دیا۔

حالؔی کو لاہور کی آب ہوا راس نہ آئی تو چار سال وہاں رہنے کے بعد وہ دہلی واپس لوٹ آئے اور اینگلو عربک کالج میں استاد ہو گئے۔یہاں ان کی ملاقات سرسید سے ہوئی جن کے افکار و آرا سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ سرسید کی تحریض پر حالؔی نے ۱۸۷۹ء اپنی مشہور زمانہ قومی نظم 'مسدس مدجزر اسلام' کہی۔جس کو سرسید نے اپنے لئے پراوانۂ نجات قرار دیا۔اس کے بعد انھوں 'حیات سعدی' لکھی جو سوانح نگاری میں پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔نیز ان کا مقدمہ دیوان کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔جس نے اردو تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور اردو تنقید کا باقاعدہ آغاز ہوا۔۱۸۹۷ء میں انھوں نے غالبؔ کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے 'یادگار غالبؔ' کے نام سے ان کی سوانح عمری تحریر کی۔جس سے غالبؔ کی عوامی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔۱۹۰۱ء انھوں نے سرسید کی سوانح پر بھی 'حیات جاوید' کے نام سے کتاب تحریر کی جو ان کی حیات اور کارناموں پر دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔حالؔی نے نثر اور نظم دونوں میں ہی اپنی فکر کے جوہر دکھائے ہیں۔

حالؔی اپنی آخری عمر واپس اپنے آبائی وطن پانی پت لوٹ گئے تھے اور وہ معاشی طور فارغ البال تھے اس

لئے کہ ۱۸۸۷ء میں سرسید کی سفارش کی وجہ سے ان کو ریاست حیدرآباد کی جانب سے امداد المصنفین کے محکمہ سے ۷۵/روپے ماہوار کا وظیفہ ملتا تھا جو بعد میں بڑھا کر ۱۰۰ روپے کر دیا گیا تھا۔حالؔی کو عرصۂ دراز سے نزلہ کا مرض لاحق تھا جو آخری عمر میں شدت اختیار کر گیا۔اس بیماری کے علاج کے طور پر انھوں نے بہت سی دوائیں کی مگر افاقہ نہ ہوا آخر الامر انھوں نے افیوں کا استعمال کیا جس نے انھیں اور بھی زیادہ نقصان پہنچایا اور ان کی آنکھ کی روشنی چلی گئی۔آخر کار اسی حال میں دسمبر ۱۹۱۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔

حالی نے ایک درجن سے زائد کتب تحریر کی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱)تریاق مسموم ۱۸۶۷ء(۲)مجالس النساء ۱۸۷۴ء(۳)طبقات الارض ۱۸۸۲ء(۴)حیات سعدی ۱۸۸۶ء (۵)مقدمہ شعر و شاعری معہ دیوان ۱۸۹۳ء(۶)یادگار غالب ۱۸۹۷ء(۷)حیات جاوید ۱۹۰۱ء(۸)مولود شریف ۱۸۶۴ تا ۱۸۷۰ء(۹)مسدس مد جزر اسلام ۱۸۷۹ء(۱۰)مجموعہ نظم حالی ۱۸۹۰ء(۱۱)مضامین حالی(۱۲)مقالات حالی(۱۳)مکاتیب حالی۔

9.3.2 حالی کی رباعی گوئی

حالؔی جدید اردو شاعری جدید اردو تنقید کے پیش رو ہیں۔انھوں نے نظم و نثر میں بہت کچھ تحریر کیا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ انھوں نے اردو کو نئے زاویۂ نگاہ سے آشنا کیا۔شاعری میں ان کی شناخت ایک اصلاحی اور افادی شاعر کی ہے۔حالؔی کی شاعری کے دو ادوار ہیں پہلے دور میں انھوں نے بھی روایتی اور عام رنگ کی شاعری کی لیکن غالب و شیفتہ اور پھر لاہور بک ڈپو کی ملازمت اور انجمن پنجاب کے مناظموں کی شرکت نے ان کی شاعری کو روایتی شاعری کے دام سے نکال کر جدید انداز فکر عطا کیا۔نیز سرسید سے دوستی نے ان کی اس فکر جلا دی اور انھوں اردو نظم و نثر میں جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔

حالؔی نے شاعری میں غزل،نظم،مرثیہ اور رباعی گوئی پر خصوصی توجہ کی ان کی رباعی گوئی بھی افادی اور اصلاحی پہلو ہی کی حامل ہیں جس میں انھوں نے مذہب اور اخلاقیات کے موضوعات پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ ان کے دیوان میں ۹۸ رباعیات موجود ہیں جو میں توحید،نعت،پند و نصائح اور اخلاقی موضوعات پائے جاتے ہیں۔حالؔی کی رباعیات کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہیں۔ان میں کسی گہرے فلسفے کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ عام اور سادہ الفاظ میں انھوں نے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا ہے۔تا کہ لوگوں کو ان کا پیغام سمجھنے میں کسی طرح کی دشواری نہ ہو۔چونکہ حالؔی کا مطمح نظر شاعری میں افادیت پسندی ہے اور وہ اس صنف کو بھی صرف پیغام رسانی کا ایک ذریعہ گردانتے ہیں اس لئے وہ فن کو بطور فن برتنے یا اسے چیستاں بنانے کے قائل نہیں ہیں۔ خلاصۂ کلام حالؔی کی رباعیات کے امتیازی اوصاف میں ہم سادگی،سلاست اور پیغام رسانی کو شمار کر سکتے ہیں۔ ذیل میں ان کی رباعیات کے کچھ نمونے پیش کئے جا رہے ہیں:

توحید

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لئے　　طاعت میں ہے تیری، آبرو سب کے لئے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور　　سب اپنے لئے ہیں، اور تو سب کے لئے

نعت

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا　　اور امیوں کو خیر امم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم تتار　　بچھڑے ہوئے گلہ کو بہم تو نے کیا

پند و نصائح

نیکوں کو نہ ٹھرائیو بدائے فرزند!　　ایک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں　　ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

اخلاقیات

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور　　پر عیب سے بچئے تا بمقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ، پر خبردار رہو　　گھٹنے سے کہیں ان کے نہ بڑھ جائے غرور

ہے عقل میں جس قدر کمی اور بیشی　　اتنی ہی مغائرت ہے یہاں
وہ دوست نہیں جس نے کیا فکر مآل　　ضدیں ہیں دوستی و دور اندیشی

9.3.3 حالی کی رباعیات کا تجزیہ

(۱)　اک گبر نے پوچھے جو اصول اسلام　　واعظ نے درشتی سے کیا اس سے کلام
بولا کہ حضور مقتدا ہوں جس کے　　ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

حالی اپنی اس رباعی میں امت کو ایک پیغام دے رہے ہیں کہ شیریں بیانی سے اکثر اوقات بڑے سے بڑا دشمن بھی آپ کا دوست بن جاتا ہے اور تلخ کلامی سے آپ کا عزیز ترین دوست بھی آپ سے دور ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس پیغام کو ایک واقعہ کی شکل میں بیان کیا ہے کہ ایک دیندار آدمی سے کسی غیر مسلم نے اسلام کے اصول اور اس کی خصوصیات کے بارے میں سوال کیا لیکن اس دیندار شخص نے اس غیر مسلم شخص کو بہت ہی درشت انداز میں جواب دیا جس کا نقصان یہ ہوا کہ وہ شخص اس دیندار کی بداخلاقی کی وجہ سے حق کو قبول کرنے سے دور ہو گیا اور اس نے اس دیندار کے طرز عمل کو وجہ بناتے ہوئے اسلام سے دوری اختیار کر لی۔

(۲)　جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں　　اور جیسا سمجھتا ہو نہ ویسا ہوں میں

اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے　　بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

حالؔی نے اپنی اس رباعی میں بھی لوگوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ اپنے ظاہر و باطن کو یکساں رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ آدمی دوسروں کے سامنے تو اچھا بنے اور لوگ اس کے عمل سے دھوکہ بھی کھا جائے لیکن انسان کا ضمیر اس کو ہر وقت باطن میں ملامت ہی کرتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کو بخوبی جانتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کو ظاہر و باطن کی یکسانیت پر خوب توجہ کرنی چاہئے اور ہر دم اپنا محاسبہ اور ظاہر و باطن کو سنوارنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

9.3.4 خلاصہ

حالی کا اصل نام خواجہ الطاف حسین تھا اور حالؔی ان کا تخلص تھا۔ ان کے اجداد غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ہرات سے ہندوستان آ کر آباد ہوئے تھے۔ اسی خاندان میں حالی کی پیدائش ۱۸۳۷ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم چار سال کی عمر میں شروع ہوئی اور اولاً انھوں قرآن پاک حفظ کیا۔ اس کے بعد انھیں فارسی سیکھنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ انھوں نے سید جعفر علی فارسی زبان کی تعلیم لی۔ فارسی کے انھوں عربی حاجی ابراھیم حسین سے سیکھی پھر انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ نو سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے ان کی رسمی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن وہ برابر علم کی جستجو میں لگے رہے انھوں نے مختلف علما کی صحبت اختیار کی اور ساتھ ہی ساتھ مطالعہ سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔

اس زمانے میں ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے ان کی پوری کفالت کی۔ جب حالی سترہ برد کے ہوئے تو ان کے گھر والوں نے ان کی شادی کر دی لیکن حالی کو تو علم حاصل کرنے کا سوادا سمایا ہوا تھا چنانچہ اس شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ایک دن کسی کو مطلع کئے بغیر گھر سے دلی کی جانب نکل پڑے اور وہاں جامع مسجد سے ملحق مدرسہ حسین بخش میں داخلہ لے لیا۔ جہاں انھوں نے مولوی نوازش علی سے درس لیا نیز انھوں نے دیگر علما سے بھی استفادہ کیا جن میں مولوی فضل حسن، مولوی امیر احمد اور میاں نذیر حسین کا م سرفہرست ہے۔ حالؔی کو ابھی دلی آئے ڈیڑھ سال ہی ہوئے تھے کہ ان کے گھر والوں کے اصرار پر انھیں دوبارہ پانی پت لوٹنا پڑا۔ حالی نے ان حالات میں بھی مطالعہ جاری رکھا لیکن انھیں اب تلاش معاش کی بھی فکر کرنی پڑ رہی تھی۔ بسیار تلاش کے بعد آخر کار انھیں ۱۸۵۶ء میں حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ایک نوکری مل گئی چنانچہ وہ پانی پت سے حصار منتقل ہو گئے۔ لیکن ابھی انھوں نے راحت کی سانس ہی لی تھی کہ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی تحریک شروع ہو گئی حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ ایک بار پھر پانی پت واپس آ گئے اور وہ مسلسل چار سال تک پانی پت میں رہے۔ انھوں انھوں نے اپنے اس قیام کے دوران پورے انہماک کے ساتھ علم کا حصول جاری رکھا انھوں نے علم التفسیر، علم الحدیث اور منطق و فلسفہ جیسے علوم عالیہ و آلیہ حاصل کئے۔

۱۸۵۷ء کے بعد حالی دوبارہ دلی واپس لوٹے اور ان کا رابطہ نواب مصطفیٰ علی خاں شیفتہ سے ہوا۔وہ حالؔی کے علم وفضل سے متاثر تھے لہٰذا انھیں نے حالؔی کو اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کردیا۔حالؔی کو غالبؔ کی بھی صحبت حاصل رہی لیکن ان پر زیادہ اثر شیفتہ کا ہی نظر آتا ہے۔۱۸۷۲ء میں جب شیفتہ کی وفات ہوئی تو حالی دہلی سے لاہور کی جانب منتقل ہوگئے۔

حالی لاہور میں چار سال وہاں رہنے کے بعد دہلی واپس لوٹ آئے اور اینگلو عربک کالج میں استاد ہو گئے۔یہاں ان کی ملاقات سرسید سے ہوئی جن کے افکار وآرا سے وہ بہت متاثر ہوئے۔سرسید کی تحریض پر حالؔی نے ۱۸۷۹ء اپنی مشہور زمانہ قومی نظم 'مسدس مد جزر اسلام' کہی۔اس کے بعد انھوں 'حیات سعدی' لکھی جو سوانح نگاری میں پہلی با قاعدہ کتاب ہے۔نیز ان کا مقدمہ دیوان کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔جس نے اردو تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔۱۸۹۷ء میں انھوں نے غالبؔ کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے 'یادگار غالبؔ کے نام سے ان کی سوانح عمری تحریر کی۔جس سے غالبؔ کی عوامی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔۱۹۰۱ء انھوں نے سرسید کی سوانح پر بھی 'حیات جاوید' کے نام سے کتاب تحریر کی جو ان کی حیات اور کارناموں پر دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔حالؔی نے نثر اور نظم دونوں میں ہی اپنی فکر کے جوہر دکھائے ہیں۔

حالؔی اپنی آخری عمر واپس اپنے آبائی وطن پانی پت لوٹ گئے تھے اور وہ معاشی طور فارغ البال تھے حالؔی کو عرصۂ دراز سے نزلہ کا مرض لاحق تھا جو آخری عمر میں شدت اختیار کر گیا۔اس بیماری کے علاج کے طور پر انھوں نے بہت سی دوائیں کیں مگر افاقہ نہ ہوا آخرالامر انھوں نے افیوں کا استعمال کیا جس نے انھیں اور بھی زیادہ نقصان پہنچایا جس سے ان کی آنکھ کی روشنی چلی گئی اور اسی حال میں دسمبر ۱۹۱۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔

حالؔی نے شاعری میں غزل ،نظم ،مرثیہ اور رباعی گوئی پر خصوصی توجہ کی ان کی رباعی گوئی بھی افادی اور اصلاحی پہلو ہی کی حامل ہیں جس میں انھوں نے مذہب اور اخلاقیات کے موضوعات پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ ان کے دیوان میں ۹۸ رباعیات موجود ہیں جو میں توحید ،نعت، پند ونصائح اور اخلاقی موضوعات پائے جاتے ہیں۔حالؔی کی رباعیات کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہیں۔ان میں کسی گہرے فلسفے کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ عام اور سادہ الفاظ میں انھوں نے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا ہے۔تاکہ لوگوں کو ان کا پیغام سمجھنے میں کسی طرح کی دشواری نہ ہو۔چونکہ حالؔی کا مطمح نظر شاعری میں افادیت پسندی ہے اور وہ اس صنف کو بھی صرف پیغام رسانی کا ایک ذریعہ گردانتے ہیں اس لئے وہ فن کو بطور فن برتنے یا اسے چیستاں بنانے کے قائل نہیں ہیں۔ خلاصۂ کلام حالؔی کی رباعیات کے امتیازی اوصاف میں ہم سادگی ،سلاست اور پیغام رسانی کو شمار کر سکتے ہیں۔

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ نے

حالی کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کی۔
حالی کی رباعی گوئی سے آگہی حاصل کی۔
حالی کی رباعیات کے موضوعات سے واقفیت حاصل کی۔
حالی کی رباعیات کا تجزیہ کیا۔

9.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1. حالی کے سوانحی کوائف مختصراً بیان کیجئے؟
2. حالی تصنیفات کے بارے میں اختصار سے بتائیں؟
3. حالی کی رباعیات کے موضوعات پر روشنی ڈالیں؟
4. حالی کی کسی رباعی کا تجزیہ پیش کریں؟
5. حالی کی رباعی گوئی پر مختصر نوٹ لکھیں؟

9.6 سوالات کے جوابات

1. حالی کا اصل نام خواجہ الطاف حسین تھا اور حالؔی ان کا تخلص تھا۔حالی کی پیدائش ۱۸۳۷ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم چار سال کی عمر میں شروع ہوئی اور اولاً انھوں قرآن پاک حفظ کیا۔اس کے بعد انھیں فارسی سیکھنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ انھوں نے سید جعفر علی فارسی زبان کی تعلیم لی۔فارسی کے بعد انھوں عربی حاجی ابراھیم حسین سے سیکھی پھر انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔نو سال کی عمر ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔لیکن وہ برابر علم کی جستجو میں لگے رہے انھوں نے مختلف علما کی صحبت اختیار کی اور ساتھ ہی ساتھ مطالعہ سے بھی بھر پور استفادہ کیا۔انھوں گھر سے بھاگ کر کچھ دن دہلی میں بھی علم حاصل کیا مگر گھر والوں کے اصرار پر وہ جلدی ہی دہلی سے لوٹ آئے۔ یہاں حصار میں انھیں ایک ملازمت ملی مگر ۱۸۵۷ء کے حالات سے انھیں اسے چھوڑنا پڑا۔وہ دوبارہ دہلی لوٹے اور نواب شیفتہ کے بچوں کے اتالیق ہو گئے۔یہاں سے وہ لاہور گئے اور وہاں بھی کچھ دن پنجاب بک ڈپو میں ملازمت لیکن جلدی ہی وہ ایک بار پھر دہلی واپس آ گئے۔یہاں کچھ دن ایک کالج میں لکچرار رہے پھر حیدرآباد سے وظیفہ یافتہ ہونے کے بعد اپنے وطن لوٹ گئے اور وہیں ۱۹۱۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

2. حالی نے ایک درجن سے زائد کتب تحریر کی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) تریاق مسموم ۱۸۶۷ء (۲) مجالس النساء ۱۸۷۴ء (۳) طبقات الارض ۱۸۸۲ء (۴) حیات سعدی ۱۸۸۶ء (۵) مقدمہ شعر و شاعری معہ دیوان ۱۸۹۳ء (۶) یادگار غالب ۱۸۹۷ء (۷) حیات جاوید ۱۹۰۱ء (۸) مولود شریف ۱۸۶۴ تا ۱۸۷۰ء (۹) مسدس مد جزر اسلام ۱۸۷۹ء (۱۰) مجموعہ نظم حالی (۱) تریاق مسموم ۱۸۶۷ء (۲) مجالس النساء ۱۸۷۴ء (۳) طبقات الارض ۱۸۸۲ء (۴) حیات سعدی ۱۸۸۶ء (۵) مقدمہ

شعر وشاعری معہ دیوان ۱۸۹۳ء (۶) یادگار غالب ۱۸۹۷ء (۷) حیات جاوید ۱۹۰۱ء (۸) مولود شریف ۱۸۶۴ تا ۱۸۷۰ء (۹) مسدس مد جزر اسلام ۱۸۷۹ء (۱۰) مجموعہ نظم حالی ۱۸۹۰ء (۱۱) مضامین حالی (۱۲) مقالات حالی (۱۳) مکاتیب حالی۔

3. حالی کے دیوان میں ۹۸ رباعیات موجود ہیں جو میں توحید، نعت، پند ونصائح اور اخلاقی موضوعات پائے جاتے ہیں۔ حالؔی کی رباعیات کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہیں۔ ان میں کسی گہرے فلسفے کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ عام اور سادہ الفاظ میں انھوں نے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا ہے۔ تا کہ لوگوں کو ان کا پیغام سمجھنے میں کسی طرح کی دشواری نہ ہو۔

4. جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں اور جیسا سمجھتا ہو نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

حالؔی نے اپنی اس رباعی میں بھی لوگوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ اپنے ظاہر و باطن کو یکساں رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ آدمی دوسروں کے سامنے تو اچھا بنے اور لوگ اس کے عمل سے دھوکہ بھی کھا جائے لیکن انسان کا ضمیر اس کو ہر وقت باطن میں ملامت ہی کرتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کو بخوبی جانتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کو ظاہر و باطن کی یکسانیت پر خوب توجہ کرنی چاہئے اور ہر دم اپنا محاسبہ اور ظاہر و باطن کو سنوارنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

5. حالؔی نے شاعری میں غزل، نظم، مرثیہ اور رباعی گوئی پر خصوصی توجہ کی ان کی رباعی گوئی بھی افادی اور اصلاحی پہلو ہی کی حامل ہیں جس میں انھوں نے مذہب اور اخلاقیات کے موضوعات پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ ان کے دیوان میں ۹۸ رباعیات موجود ہیں جو میں توحید، نعت، پند ونصائح اور اخلاقی موضوعات پائے جاتے ہیں۔ حالؔی کی رباعیات کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہیں۔ ان میں کسی گہرے فلسفے کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ عام اور سادہ الفاظ میں انھوں نے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا ہے۔ تا کہ لوگوں کو ان کا پیغام سمجھنے میں کسی طرح کی دشواری نہ ہو۔ چونکہ حالؔی کا مطمح نظر شاعری میں افادیت پسندی ہے اور وہ اس صنف کو بھی صرف پیغام رسانی کا ایک ذریعہ گردانتے ہیں اس لئے وہ فن کو بطور فن برتنے یا اسے چیستاں بنانے کے قائل نہیں ہیں۔ خلاصۂ کلام حالؔی کی رباعیات کے امتیازی اوصاف میں ہم سادگی، سلاست اور پیغام رسانی کو شمار کر سکتے ہیں۔

9.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
علوم عالیہ	وہ علوم جو لائق قدر ہوں مثلاً قرآن، حدیث تفسیر، فقہ وغیرہ
علوم آلیہ	وہ علوم جو دوسرے علوم کو سمجھنے میں مددگار ہوں جیسے نحو وصرف

سے زبان کا علم حاصل ہوتا ہے۔

کفالت	ذمیداری اٹھانا، خیال رکھنا
سوداسمانا	کسی چیز کی دھن ہونا
بسیار	بہت زیادہ
اتالیق	جو بچوں علم اورادب سکھائے، استاد
تصحیح	صحیح کرنا
مبلّغ	پہنچانے والا، کسی کام کی طرف بلانے والا
مدوجزر	جوار بھاٹا، گھٹنا بڑھنا
فارغ البال	معاشی طور پر آزاد ہونا،
زاویۂ نگاہ	دیکھنے کا طریقہ
افادی	فائدہ مند

9.8 کتب برائے مطالعہ

1. دیوان حالی	الطاف حسین حالی
2. الطاف حسین حالی	صالحہ عابد حسین
3. رباعیات حالی	محمد رحمت اللہ رعد
4. حیات حالی	سید محمد فاروق
5. حالی کا نظریہ شعری	ناظر کاکوروی

اکائی 10. یاس یگانہ چنگیزی: حیات اور رباعی گوئی

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 یگانہ: حیات اور رباعی گوئی

10.3.1 یگانہ: سوانحی کوائف

10.3.2 یگانہ کی رباعی گوئی

10.3.3 یگانہ کی رباعیات کا تجزیہ

10.3.4 خلاصہ

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

10.5 اپنا امتحان خود لیجئے

10.6 سوالات کے جوابات

10.7 کلیدی الفاظ

10.8 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کرنے کے بعد آپ

یگانہ کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کریں گے۔

یگانہ کی رباعی نگاری سے متارف ہوں گے۔

یگانہ کی رباعیات کا تجزیہ کر کے اسے سمجھیں گے۔

10.2 تمہید

طلبائے گرامی! آپ گزشتہ اکائی میں حالی کے سوانحی کوائف اور ان کی رباعی گوئی سے آگاہ ہوئے اب اس اکائی میں آپ یاس یگانہ چنگیزی کے سوانحی کوائف سے آشنا ہوں گے اور ان کی رباعی گوئی سے بحث کریں گے۔ان کی رباعیات کے امتیازات کو سمجھیں گے۔

10.3 یگانہ: حیات اور رباعی گوئی

10.3.1 یگانہ: سوانحی کوائف

یاسؔ یگانہ چنگیزی کا اصل نام مرزا واجد حسین اور یاسؔ تخلص تھا۔ وہ عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک معزز گھرانے میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ یگانہ نسلاً مغل تھے اور سپہ گری ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ یگانہ کی ابتدائی تعلیم ان کے آبائی محلے مغلپورہ کے ایک مدرسے میں ہوئی جہاں انھوں نے فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ انگریزی تعلیم کے لیے انھوں نے محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی میں داخلہ لیا اور اپنی ذہانت و فطانت کے باعث ہر درجے میں اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے درجہ دوم میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا لیکن بدقسمتی سے وہ مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے اور انھیں تلاش معاش کے لیے سرگرداں ہونا پڑا۔ اولاً وہ کلکتہ میں واجد علی شاہ کے نواسے کے انگریزی کے اتالیق مقرر ہوئے مگر کلکتہ کی آب و ہوا راس نہ آنے سبب وہ بیمار رہنے لگے اور آخر کار وہ عظیم آباد (پٹنہ) لوٹ آئے۔ ۱۹۰۵ء میں آب و ہوا کی تبدیلی اور فکر معاش دونوں کے پیش نظر انھوں نے لکھنؤ کی جانب رخت سفر باندھا اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یگانہ کی شادی لکھنؤ میں ہی ہوگئی جو ان کے یہاں مستقل قیام کی وجہ بن گئی نیز لکھنؤ کی شعری و ادبی فضا نے ہزار عداوتوں اور علمی مباحثوں کے باوجود ان کو یہاں سے جانے نہ دیا۔ یہیں ان کا ۱۹۵۶ء میں انتقال ہوا۔

یگانہؔ کا تعلق چونکہ عظیم آباد (پٹنہ) سے تھا اور اس زمانے میں شادؔ عظیم آبادی کی شاعری کا دور دورہ تھا چنانچہ انھوں نے ان سے شعری اصلاح لینی شروع کر دی۔ اس وقت ان کا تخلص یاسؔ ہوا کرتا تھا۔ جب یگانہ لکھنؤ میں مقیم ہو گئے اور انھوں نے پیارے صاحب رشیدؔ سے اصلاح لینی شروع کی تو اپنا تخلص تبدیل کر کے یگانہؔ کر لیا۔

یگانہؔ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری سلاست و روانی کا مرقع ہے۔ وہ زبان و بیان پر استادانہ مہارت رکھتے ہیں اور اپنے خیالات و جذبات کی عکاسی میں وہ اس قدر ماہر ہیں کہ ان کی شاعری بالکل فطری معلوم ہوتی ہے جس میں ان کی ذاتی زندگی کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ یگانہؔ کی شاعری میں بلند آہنگی اور جذبۂ خود پرستی کی بہتات ہے نیز اپنے جذبات کی عکاسی میں ان کا لب و لہجہ بسا اوقات بہت ہی جارحانہ ہو جاتا ہے لیکن یہی شدت ان کا وصف خاص بھی ہے اور ان کی کمزوری بھی۔ وہ اس خاص ادا کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ ان کی اس شاعرانہ روش کی تقلید اردو شاعری میں کوئی نہیں کر سکا۔

یگانہؔ قیام لکھنؤ کے ابتدائی کچھ سالوں میں بہت معروف ہوئے اور ان کے نئے لب و لہجے اور جدید آہنگ نے بہت سے لوگوں کی توجہ اپنی جانب منعطف کروائی اور انھیں یہاں خاطر خواہ پذیرائی ملنے لگی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کے بعض معاصرین کو ان سے بیجا حسد پیدا ہو گیا۔ جو ابتدا میں فنی مباحث کے ذریعہ ظاہر ہوا پھر یہ

مذہبی نوعیت کی صورت اختیار کر گیا جس میں یگانہ کی بعض غلطیوں نے آگ پر گھی کا کام کیا اور ان کو لکھنؤ میں وہ دن دیکھنے پڑے جب انھیں لکھنؤ کی گلیوں میں سرعام رسوا کیا گیا۔

یگانہ ایک حقیقت پرست انسان تھے اور انھیں لکھنؤ کے بیجا تکلفات اور ریاکارانہ معاشرے سے سخت نفرت تھی اسی طرح انھیں وہاں کی غیر فطری شاعری اور زبان و بیان پر متعصّبانہ اجارہ داری سے بھی سخت اختلاف تھا۔ مگر نوابان لکھنؤ نے جس نہج پر اس معاشرے کو تشکیل دیا تھا اس سے مکمل انحراف اہل لکھنؤ کے لیے بہت ہی حیرت انگیز اور نا قابل قبول تھا۔ جب کہ یگانہ اسے منافقانہ روش پر محمول کرتے تھے اور وہ اس کے خلاف جارحانہ انداز میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ دونوں جانب سے جواب جواب الجواب کا ایک سلسلہ عرصۂ دراز تک چلتا رہا لیکن نہ اہل لکھنؤ اپنی مقلدانہ روش سے ہٹے اور نہ یگانہ چرکہ لگانے سے باز آئے۔

10.3.2 یگانہ کی رباعی گوئی

یگانہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور انھوں نے اسی صنف میں سب سے زیادہ کلام بھی کہا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یگانہ نہ صرف ماہر غزل گو تھے بلکہ وہ دیگر اصناف شعر کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور فن عروض میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فن عروض میں ان کی کتاب 'چراغ سخن' نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں انھوں نے عروض کے ساتھ ساتھ اپنے تنقیدی افکار و خیالات کو بھی بیان کیا ہے جس سے شاعری کے فن کے تئیں ان کے نظریات واضح ہو جاتے ہیں اور اس فن پر ان کی استادانہ مہارت کا بھی ثبوت بہم پہنچ جاتا ہے۔

غزل کے علاوہ یگانہ کی شہرت جس صنف سے متعلق ہے وہ رباعی گوئی ہے۔ یگانہ نے اپنی رباعیات کا مجموعہ 'ترانہ' کے نام سے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا۔ نیز ان کے کلیات گنجینہ میں بھی ۱۶۳ رباعیات شامل ہیں جو زیادہ تر اسی مجموعے سے ماخوذ ہیں۔

یگانہ کی رباعیات مختلف النوع موضوعات کا مجموعہ ہیں۔ جن میں حیات و کائنات کے بہت سے مسائل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان رباعیات میں مذہب، تصوف اخلاق، فلسفہ، عشق، طنز اور محاورات و ضرب الامثال کو نئے لب لہجے اور نئے اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں تک ان کی مذہبی رباعیات کا تعلق ہے یہ موضوع ان کے یہاں معکوسی انداز میں برتا گیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مذہب کے تئیں ان کا رویہ معاندانہ اور تمسخر آمیز ہے۔ وہ مذہب اور مذہبی معاشرے پر طنز کستے ہوئے نظر آتے ہیں:

قربانی کا حکم ہے چلو یونہی سہی — گردن پہ کسی غریب کا خوں ہی سہی
نیت ہے بخیر اپنی تو پروا کیا ہے — بکرا نہ سہی موٹی سی ایک جوں ہی سہی

ان کی متصوفانہ رباعیات بھی روایتی قسم کی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اس لیے کہ یگانہ کے یہاں جیسی مذہب بیزاری پائی جاتی ہے اس کے ساتھ تصوف کا کوئی میل نہیں ہو سکتا اور نہ وہ اس کی تفہیم کے متحمل تھے۔ یگانہ کی عشقیہ

رباعیات بھی روایتی قسم سے الگ ہیں ان کا طریقۂ عشق بھی جارحانہ اور خود پرستی سے مملو ہے۔ وہ محبوب کا ناز اٹھانے، اس کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے اور محبوب کو ہر چیز پر فوقیت دینے کے بجائے وہ اس سے برابر سرابر کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی انا انھیں ان کے محبوب کے سامنے جھکنے سے بھی روکتی ہے بلکہ وہ مغرور محبوب کو نیچا دکھانے سے بھی باز نہیں آتے۔ ظاہر سی بات ہے ایسا عشق نہ روایت شاعری کے لحاظ سے مانوس ہے اور نہ ہی حقیقی طور پر اسے سند قبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ یگانہ کے یہاں عشق کی وہ تابنا کی اور سوزش نہیں پائی جاتی جو اردو شاعری کا وصف خاص ہے بلکہ ان کا عشق لمسیاتی اور بسا اوقات بہت ہی بھونڈا معلوم ہوتا ہے:

مخمور مئے شباب ہو لینا تھا　　کم سے کم ایک نیند سو لینا تھا
دامانِ ہوس کہیں بھگو لینا تھا　　بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینا تھا

یگانہ اپنی رباعیات میں اخلاق، فلسفہ اور طنز کے موضوع کو ہی بڑی حد تک صحیح طور پر پیش کر سکے ہیں جس کا اندازہ ان کی ان رباعیات سے کیا جا سکتا ہے:

اخلاق

دل ہو مردہ تو زندگی بھی حرام　　پیری کا ذکر کیا جوانی بھی حرام
افسانۂ عمر جاودانی بھی حرام　　آب حیواں کہاں کا پانی بھی حرام

اخلاق

دنیا کے مزے میں ڈوب کر کیا کرتے　　آنکھیں رکھتے تو کیوں گڑھے میں گرتے
لو دیکھ لو اب عیش پرستوں کی دسا　　مردے دیکھے نہ ہوں گے چلتے پھرتے

فلسفہ

تھمنے کا نہیں قافلہ موجِ سراب　　کٹنے کا نہیں مرحلہ موجِ سراب
آغاز ہی آغاز ہے، انجام کجا؟　　عالم ہے عجب سلسلۂ موجِ سراب

حاصل کلام یگانہ کی رباعی گوئی اگر چہ اردو میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے لیکن یہ بہت اعلیٰ درجے کی شاعری نہیں معلوم ہوتی۔ نہ اس میں کوئی مربوط فلسفہ ملتا ہے نہ ہی حسن و عشق کا سوز و ساز بلکہ ان کی رباعیات بہت ہی سپاٹ قسم کی معلوم ہوتی ہیں جن میں گہرائی و گیرائی کا عنصر مفقود ہے۔ یگانہ اگر اس صنف کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرتے تو شاید وہ انفرادی لب و لہجے کے علاوہ دوسری خصوصیات کو بھی اپنی رباعیات میں سمو لیتے لیکن وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کمی نے ان کی شاعری کو بالعموم اور ان کی رباعی گوئی کو بالخصوص بہت نقصان پہنچایا۔

10.3.3 یگانہ کی رباعیات کا تجزیہ

ہاں اے دل ایذا طلب آرام نہ لے　　بدنام نہ ہو مفت کا الزام نہ لے
ہاتھ آ نہ سکے پھول تو کانٹا ہی سہی　　ناکام پلٹنے کا کبھی نام نہ لے

یگانہ اس رباعی میں جہد مسلسل کا پیغام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ اے میرے ایذا برداشت کرنے والے دل تو مسلسل ایذا برداشت کرتا جا کیوں کہ کوشش چھوڑ دینے والے کو لوگ برا بھلا کہتے ہیں اور اس پر الزام لگاتے ہیں کہ جب کام کو مکمل ہی نہیں کرنا تھا تو شروع ہی کیوں کیا۔ اس لئے ناکامی کے خوف سے کوشش مت چھوڑو۔ اگر پھول ہاتھ نہیں آتا تو کم از کم کانٹا تو مل ہی جائے گا۔ کیونکہ کوشش کرنے والا کے ہاتھ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ضرور لگ جاتا ہے اور یہ ناکام اور نامراد ہونے سے بہتر ہے کہ چھوٹی کامیابی ہی ہاتھ لگ جائے۔

فکر انجام خار پیراہن ہے　　یہ رنگ یہ بو غبار پیرہن ہے
نازک ایک ایک تارِ پیراہن ہے　　دو دن میں خزان بہارِ پیراہن ہے

یگانہ اس رباعی میں بے ثباتی حیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انجام کی فکر انسان کے دل میں کانٹے کے مانند چبھتی رہتی ہے۔ یہ دنیا کی رنگینی، صحت و تندرستی اور حسن و شباب غبار کی طرح بے وقعت ہے۔ جس کو مٹ جانا ہے۔ پیراہن انسانی کا ایک ایک تار بہت ہی نازک ہے۔ یعنی انسانی جسم یا اس کی سانس اور جسم کا رشتہ بہت ہی نازک ہے یہ کب ٹوٹ جائے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ دنیا کی زندگی یا اس کی بہار صرف دو دن کی مہمان ہے۔ اس لئے انسان کو ہمیشہ اپنے انجام کی فکر کرنی چاہیے اور دنیاوی اسباب پر بالکل بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

10.3.4 خلاصہ

یاسؔ یگانہ چنگیزی کا اصل نام مرزا واجد حسین اور یاسؔ تخلص تھا۔ وہ عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک معزز گھرانے میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ یگانہ نسلاً مغل تھے اور سپہ گری ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ یگانہ کی ابتدائی تعلیم ان کے آبائی محلے مغلپورہ کے ایک مدرسے میں ہوئی جہاں انھوں نے فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ انگریزی تعلیم کے لیے انھوں نے محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی میں داخلہ لیا اور اپنی ذہانت و فطانت کے باعث ہر درجے میں اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے درجہ دوم میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا لیکن بدقسمتی سے وہ مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے اور انھیں تلاش معاش کے لیے سرگرداں ہونا پڑا۔ اولاً وہ کلکتہ میں واجد علی شاہ کے نواسے کے انگریزی کے اتالیق مقرر ہوئے مگر کلکتہ کی آب و ہوا راس نہ آنے سبب وہ بیمار رہنے لگے اور آخر کار وہ عظیم آباد (پٹنہ) لوٹ آئے۔ ۱۹۰۵ء میں آب و ہوا کی تبدیلی اور فکر معاش دونوں کے پیش نظر انھوں نے لکھنؤ کی جانب رخت سفر باندھا اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یگانہ کی

شادی لکھنؤ میں ہی ہوگئی جوان کے یہاں مستقل قیام کی وجہ بن گئی نیز لکھنؤ کی شعری وادبی فضا نے ہزار عداوتوں اور علمی مباحثوں کے باوجود ان کو یہاں سے جانے نہ دیا۔ کچھ عرصے کے لئے وہ حیدرآباد گئے لیکن ان کو وہ شہر راس نہ آیا وہ لکھنؤ واپس آ گئے اور آخری دم تک یہیں رہے۔

یگانہ کی شہرت جس صنف سے متعلق ہے وہ رباعی گوئی ہے۔ یگانہ نے اپنی رباعیات کا مجموعہ 'ترانہ' کے نام سے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا۔ نیز ان کے کلیات گنجینہ میں بھی ۱۶۳ رباعیات شامل ہیں جو زیادہ تر اسی مجموعے سے ماخوذ ہیں۔

یگانہ کی رباعیات مختلف النوع موضوعات کا مجموعہ ہیں۔ جن میں حیات وکائنات کے بہت سے مسائل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان رباعیات میں مذہب، تصوف اخلاق، فلسفہ، عشق، طنز اور محاورات وضرب الامثال کو نئے لب لہجے اور نئے اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں تک ان کی مذہبی رباعیات کا تعلق ہے یہ موضوع ان کے یہاں معکوسی انداز میں برتا گیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مذہب کے تئیں ان کا رویہ معاندانہ اور تمسخر آمیز ہے۔ وہ مذہب اور مذہبی معاشرے پر طنز کستے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی متصوفانہ رباعیات بھی روایتی قسم کی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اس لیے کہ یگانہ کے یہاں جیسی مذہب بیزاری پائی جاتی ہے اس کے ساتھ تصوف کا کوئی میل نہیں ہوسکتا اور نہ وہ اس کی تفہیم کے متحمل تھے۔

حاصل کلام یگانہ کی رباعی گوئی اگر چہ اردو میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے لیکن یہ بہت اعلیٰ درجے کی شاعری نہیں معلوم ہوتی۔ نہ اس میں کوئی مربوط فلسفہ ملتا ہے نہ ہی حسن وعشق کا سوز وساز بلکہ ان کی رباعیات بہت ہی سپاٹ قسم کی معلوم ہوتی ہیں جن میں گہرائی وگیرائی کا عنصر مفقود ہے۔ یگانہ اگر اس صنف کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرتے تو شاید وہ انفرادی لب ولہجے کے علاوہ دوسری خصوصیات کو بھی اپنی رباعیات میں سمو لیتے لیکن وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کمی نے ان کی شاعری کو بالعموم اور ان کی رباعی گوئی کو بالخصوص بہت نقصان پہنچایا۔

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ نے

یگانہ کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کی۔

یگانہ کی رباعی گوئی سے آگہی حاصل کی۔

یگانہ کی رباعیات کے موضوعات سے واقفیت حاصل کی۔

یگانہ کی رباعیات کا تجزیہ کیا۔

10.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1. یگانہ کے سوانحی کوائف مختصراً بیان کیجئے؟
2. یگانہ کی رباعیات کے موضوعات پر روشنی ڈالیں؟
3. یگانہ کی کسی ایک رباعی کا تجزیہ پیش کریں؟
4. یگانہ کی رباعی گوئی کے امتیازات کو مختصراً بیان کریں؟

10.6 سوالات کے جوابات

1. یاسؔ یگانہ چنگیزی کا اصل نام مرزا واجد حسین اور یاسؔ تخلص تھا۔ وہ عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک معزز گھرانے میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ یگانہ نسلاً مغل تھے اور سپہ گری ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ یگانہ کی ابتدائی تعلیم ان کے آبائی محلے مغلپورہ کے ایک مدرسے میں ہوئی جہاں انھوں نے فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ انگریزی تعلیم کے لیے انھوں نے محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی میں داخلہ لیا اور اپنی ذہانت و فطانت کے باعث ہر درجے میں اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے درجہ دوم میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا لیکن بدقسمتی سے وہ مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے اور انھیں تلاش معاش کے لیے سرگرداں ہونا پڑا۔ اولاً وہ کلکتہ میں واجد علی شاہ کے نواسے کے انگریزی کے اتالیق مقرر ہوئے مگر کلکتہ کی آب و ہوا راس نہ آنے سبب وہ بیمار رہنے لگے اور آخر کار وہ عظیم آباد (پٹنہ) لوٹ آئے۔ ۱۹۰۵ء میں آب و ہوا کی تبدیلی اور فکر معاش دونوں کے پیش نظر انھوں نے لکھنؤ کی جانب رخت سفر باندھا اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یگانہ کی شادی لکھنؤ میں ہی ہوگئی جو ان کے یہاں مستقل قیام کی وجہ بن گئی نیز لکھنؤ کی شعری و ادبی فضا نے ہزار عداوتوں اور علمی مباحثوں کے باوجود ان کو یہاں سے جانے نہ دیا۔ کچھ عرصے کے لئے وہ حیدرآباد گئے لیکن ان کو وہ شہر راس نہ آیا وہ لکھنؤ واپس آ گئے اور آخری دم تک یہیں رہے۔

2. یگانؔہ کی رباعیات مختلف النوع موضوعات کا مجموعہ ہیں۔ جن میں حیات و کائنات کے بہت سے مسائل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان رباعیات میں مذہب، تصوف اخلاق، فلسفہ، عشق، طنز اور محاورات و ضرب الامثال کو نئے لب لہجے اور نئے اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں تک ان کی مذہبی رباعیات کا تعلق ہے یہ موضوع ان کے یہاں معکوسی انداز میں برتا گیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مذہب کے تئیں ان کا رویہ معاندانہ اور تمسخر آمیز ہے۔ وہ مذہب اور مذہبی معاشرے پر طنز کستے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی متصوفانہ رباعیات بھی روایتی قسم کی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اس لیے کہ یگانؔہ کے یہاں جیسی مذہب بیزاری پائی جاتی ہے اس کے ساتھ تصوف کا کوئی میل نہیں ہوسکتا اور نہ وہ اس کی تفہیم کے متحمل تھے۔ یگانؔہ کی عشقیہ رباعیات بھی روایتی قسم سے الگ ہیں ان کا طریقۂ عشق بھی جارحانہ اور خود پرستی سے مملو ہے۔ وہ محبوب کا ناز اٹھانے، اس کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے اور محبوب کو ہر چیز پر فوقیت دینے کے بجائے وہ اس سے برابر سرابر کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی انا

انھیں ان کے محبوب کے سامنے جھکنے سے بھی روکتی ہے بلکہ وہ مغرور محبوب کو نیچا دکھانے سے بھی باز نہیں آتے۔ظاہر سی بات ہے ایسا عشق نہ روایت شاعری کے لحاظ سے مانوس ہے اور نہ ہی حقیقی طور پر اسے سند قبولیت حاصل ہوسکتی ہے۔ یگانہ کے یہاں عشق کی وہ تابنا کی اور سوزش نہیں پائی جاتی جو اردو شاعری کا وصف خاص ہے بلکہ ان کا عشق لمسیاتی اور بسا اوقات بہت ہی بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔ یگانہ اپنی رباعیات میں اخلاق، فلسفہ اور طنز کے موضوع کو ہی بڑی حد تک صحیح طور پر پیش کر سکے ہیں۔

3. ہاں اے دل ایذا طلب آرام نہ لے بدنام نہ ہو مفت کا الزام نہ لے
ہاتھ آ نہ سکے پھول تو کانٹا ہی سہی ناکام پلٹنے کا کبھی نام نہ لے

یگانہ اس رباعی میں جہد مسلسل کا پیغام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ اے میرے ایذا برداشت کرنے والے دل تو مسلسل ایذا برداشت کرتا جا کیوں کہ کوشش چھوڑ دینے والے کو لوگ برا بھلا کہتے ہیں اور اس پر الزام لگاتے ہیں کہ جب کام کو مکمل ہی نہیں کرنا تھا تو شروع ہی کیوں کیا۔اس لئے ناکامی کے خوف سے کوشش مت چھوڑو۔اگر پھول ہاتھ نہیں آتا تو کم از کم کانٹا تو مل ہی جائے گا۔کیونکہ کوشش کرنے والے کے ہاتھ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ضرور لگ جاتا ہے اور یہ ناکام اور نامراد ہونے سے بہتر ہے کہ چھوٹی کامیابی ہی ہاتھ لگ جائے۔

4. یگانہ کی شہرت جس صنف سے متعلق ہے وہ رباعی گوئی ہے۔یگانہ نے اپنی رباعیات کا مجموعہ 'ترانہ' کے نام سے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا۔نیز ان کے کلیات گنجینہ میں بھی ۱۶۳ رباعیات شامل ہیں جو زیادہ تر اسی مجموعے سے ماخوذ ہیں۔

یگانہ کی رباعیات مختلف النوع موضوعات کا مجموعہ ہیں۔جن میں حیات و کائنات کے بہت سے مسائل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان رباعیات میں مذہب،تصوف اخلاق،فلسفہ،عشق،طنز اور محاورات وضرب الامثال کو نئے لب لہجے اور نئے اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔جہاں تک ان کی مذہبی رباعیات کا تعلق ہے یہ موضوع ان کے یہاں معکوسی انداز میں برتا گیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مذہب کے تئیں ان کا رویہ معاندانہ اور تمسخر آمیز ہے۔وہ مذہب اور مذہبی معاشرے پر طنز کستے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کی متصوفانہ رباعیات بھی روایتی قسم کی معلوم ہوتی ہیں۔وہ اس لیے کہ یگانہ کے یہاں جیسی مذہب بیزاری پائی جاتی ہے اس کے ساتھ تصوف کا کوئی میل نہیں ہوسکتا اور نہ وہ اس کی تفہیم کے متحمل تھے۔یگانہ کی عشقیہ رباعیات بھی روایتی قسم سے الگ ہیں ان کا طریقۂ عشق بھی جارحانہ اور خود پرستی سے مملو ہے۔

حاصل کلام یگانہ کی رباعی گوئی اگر چہ اردو میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے لیکن یہ بہت اعلیٰ درجے کی شاعری نہیں معلوم ہوتی۔نہ اس میں کوئی مربوط فلسفہ ملتا ہے نہ ہی حسن وعشق کا سوز وساز بلکہ ان کی رباعیات بہت

ہی سپاٹ قسم کی معلوم ہوتی ہیں جن میں گہرائی و گیرائی کا عنصر مفقود ہے۔ یگانہ اگر اس صنف کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرتے تو شاید وہ انفرادی لب و لہجے کے علاوہ دوسری خصوصیات کو بھی اپنی رباعیات میں سمو لیتے لیکن وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کمی نے ان کی شاعری کو بالعموم اور ان کی رباعی گوئی کو بالخصوص بہت نقصان پہنچایا ۔

10.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
مباحثہ	بحث کرنا
انحراف	پھرنا
فطانت	ہوشیاری
منافق	دوغلہ، دھوکہ باز
مقلّدِ	پیچھے چلنے والا
تفہیم	سمجھ
جارح	چوٹ پہنچانے والا
مملو	بھرا ہوا، پُر

10.8 کتب برائے مطالعہ

1. ترانہ	مرزا یاس یگانہ چنگیزی
2. رباعیات یگانہ	مرتب عادل اسیر دہلوی
3. مرزا یاس یگانہ چنگیزی	تمثیل احمد
4. یاس یگانہ چنگیزی	راہی معصوم رضا
5. کلیات یگانہ	مرتب وسیم فرحت

اکائی11. میرانیس: حیات اور رباعی گوئی

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 میرانیس: حیات اور رباعی گوئی

11.3.1 میرانیس: سوانحی کوائف

11.3.2 میرانیس کی رباعی گوئی

11.3.3 میرانیس کی رباعیات کا تجزیہ

11.3.4 خلاصہ

11.4 آپ نے کیا سیکھا؟

11.5 اپنا امتحان خود لیجئے

11.6 سوالات کے جوابات

11.7 کلیدی الفاظ

11.8 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کرنے کے بعد آپ

میرانیس کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کریں گے۔

میرانیس کی رباعی نگاری سے متارف ہوں گے۔

میرانیس کی رباعیات کا تجزیہ کر کے اسے سمجھیں گے۔

11.2 تمہید

طلبائے گرامی! آپ گزشتہ اکائی میں یگانہ کے سوانحی کوائف اور ان کی رباعی گوئی سے آگاہ ہوئے اب اس اکائی میں آپ میر ببر علی انیسؔ کے سوانحی کوائف سے آشنا ہوں گے اور ان کی رباعی گوئی سے بحث کریں گے۔ ان کی رباعیات کے امتیازات کو سمجھیں گے۔

11.3 میر انیس: حیات اور رباعی گوئی

11.3.1 میر انیس: سوانحی کوائف

میر ببر علی نام انیسؔ تخلص ۱۸۰۲ء میں بہ مقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ والد گرامی میر مستحسن خلیق اور جد میر حسن دہلوی (صاحب مثنوی سحر البیان) جو میر ضاحک کے صاحبزادے تھے گویا سارا خاندان علم و کمال کا حامل تھا۔ انیس کے پردادا میر ضاحک کا اصل نام سید غلام حسین تھا اور ان کا خاندان ہرات سے دلی میں آ کر آباد ہوا تھا ان کے خاندانی سلسلے پر روشنی ڈالتے ہوئے حیات انیس کے مصنف امجد علی اشہری لکھتے ہیں: ''تذکرۂ آب حیات میں لکھا ہے کہ ان کے بزرگ ہرات سے آ کر پرانی دلی میں آباد ہوئے صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیمی لکھتے ہیں کہ دلی میں بجل مسجد کے پاس رہتے تھے اور حکیم قدرت اللہ قاسم فرماتے ہیں کہ مرحوم کی ولادت سید واڑہ میں ہوئی کہ پرانی دلی میں ایک محلّہ تھا۔ خاندانی سیادت ان کا سندی تھا۔ امامی ہروی کی اولاد میں تھے اور شاعری بھی گھرانے میں میراث میں چلی آتی تھی''

(حیات انیس، مولانا سید امجد علی اشہری، مطبع آگرہ اخبار، ۱۹۰۷ء، ص ۶)

میر ضاحکؔ نے دلی سے ہجرت کی اور فیض آباد میں مقیم ہوئے ان کے ساتھ ان کے جواں سال صاحبزادے میر حسن بھی تھے یہاں انھوں نے وہ نواب سرفراز جنگ خلف نواب سالار جنگ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ میر حسن نے فن شاعری میں اپنے والد کے علاوہ کئی استادانِ فن سے اصلاح لی دلی میں انھوں میر درد اور ذوق کو اپنا کلام دکھایا پھر اودھ وہ ضیاء الدین ضیاء کے شاگرد ہوئے نیز انھوں سوداؔ سے بھی اپنے کلام پر اصلاح لی۔ اردو شاعری میں ان کی مثنوی 'سحر البیان' ایک شہ پارے کا درجہ رکھتی ہے۔ میر انیس کا والد میر مستحسن خلیق بھی شاعر تھے اور انھوں نے مرثیہ گوئی میں بہت شہرت پائی۔ میر ببر علی انیسؔ اسی مشہور خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔

میر انیسؔ کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی۔ جب وہ لکھنؤ منتقل ہوئے تو یہاں بھی انھوں نے نجی طور پر تعلیم حاصل کرنے کا مشغلہ جاری رکھا اور اپنی فطری ذہانت و فطانت سے رسمی تعلیم کی کمی کو حتیٰ المقدور پورا کرنے کی کوشش میں مشغول رہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ انھوں نے فنون سپہ گری کی خوب مشق بہم پہنچائی۔

میر انیسؔ کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا اور رواج زمانہ کے مطابق انھوں نے بھی غزل سے شاعری کی ابتدا کی لیکن اپنے والد گرامی نصیحت کو قبول کرتے ہوئے انھوں نے غزل گوئی کو ترک کر دیا اس کے بعد انھوں نے رثائی ادب میں وہ مقام حاصل کیا جہاں تک پہنچنا ایک مشکل ترین عمل ہے۔ واقعات کربلا اور اس سے متعلق چیزوں کو انھوں نے جس خوبی کے ساتھ ادب میں پیش کیا ہے وہ ان کے نابغۂ عصر ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ چنانچہ ان کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے ہندوستان کے مختلف شہروں سے انھیں مرثیہ خوانی کے لیے دعوت دی گئی جہاں ہزاروں کی تعداد میں سامعین نے براہ راست ان سے مراثی سنے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بنارس،

الہ آباد، پٹنہ (عظیم آباد) اور حیدر آباد (دکن) وغیرہ کا سفر کیا۔ انیسؔ نے اپنی شاعرانہ زندگی میں بہت بڑی تعداد میں مرثیے، سلام، نوحے اور رباعیات تخلیق کیں جو ان کو ادب میں ہمیشہ زندہ و جاوید رکھنے کے لیے کافی ووافی ہیں۔ میر انیسؔ نے سن شعور سے تاحین حیات اس فن کی آبیاری کی اور آخر میں تپ دق اور دردسر کے امراض میں ایک ماہ مبتلا رہ کر ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۰ ستمبر ۱۸۷۴ء کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کی جانب کوچ کیا اور سبزی منڈی میں واقع اپنے باغ میں مدفون ہوئے۔

11.3.2 میر انیس کی رباعی گوئی

میر انیسؔ اردو کے سب سے بڑے مرثیہ گو ہیں۔ انھوں نے واقعات کربلا اور اہل بیت اطہار کے تعلق سے اپنے عقائد اور اپنی عقیدت دونوں کو شاعری کی مختلف اصناف اور ہیئتوں میں بخوبی برتا ہے۔ ان اصناف میں سے ایک ہیئتی اصناف رباعی بھی ہے۔ انیسؔ نے اردو مرثیہ کے ساتھ ساتھ اردو رباعی گوئی کو بھی بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔ اردو میں ان سے زیادہ متنوع الموضوعات رباعیات کسی دوسرے نے نہیں کہی ہیں۔ ان کی رباعیات کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے لائق اعتنا ہیں۔ انیسؔ سے ماقبل بھی اردو میں رباعی گوئی کی ایک مستحکم روایت موجود تھی۔ خود مرثیہ گویوں کے یہاں مرثیہ سے پہلے رباعیات پیش کرنے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ انیسؔ نے بھی اسی روش کا تتبع کیا اور انھوں مرثیہ خوانی سے قبل پڑھنے کے لیے خصوصی طور پر رباعیات تحریر کیں۔

انیسؔ نے کم وبیش چھ سو رباعیات تحریر کی ہیں۔ ان میں وہ تمام موضوعات پائے جاتے جو ان سے قبل رباعی گویوں نے برتے سوائے خمریات کہ انھوں نے اس کو مذہبی نقطۂ نظر سے مناسب نہیں سمجھا۔ ان کے یہاں رباعیات میں بھی رثائی موضوعات ہی کی کثرت ہے۔ انیسؔ سے ماقبل بھی رثائی موضوعات کو رباعی گوئی میں برتا جا رہا تھا لیکن انھوں نے اس موضوع کو بطور خاص وسعت بخشا۔ 'مجموعۂ رباعیات انیس' کے مرتب سید محمد عباسی نے ان کی رباعیات کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں: (۱) مذہبیات اس کے تحت انھوں نے حمد، نعت، منقبت، معتقدات اور مراثی کو شامل کیا ہے۔ (۲) اخلاقیات (۳) ذاتیات۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ان کی رباعیات کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں: مذہبی رباعیات، اخلاقی رباعیات، فلسفیانہ رباعیات، سماجی رباعیات، اور ذاتی رباعیات۔

میر انیسؔ کی مذہبی رباعیات اردو ادب میں ایک لائق قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حمد، نعت، منقبت، عقائد، اور رثاء نے اردو شاعری میں نئے باب وا کیے۔ معتقدات کے موضوع میں تو ان میں آیا۔ ان کی مرثیہ گوئی تو کمال ہے ہی لیکن ان کی رباعی گوئی بھی کسی طرح مراثی سے کم درجے کی نہیں ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''میر انیس کے ایک بڑے رباعی گو شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ اگر میر انیس مرثیہ نہ کہتے تو ان

کی رباعیات ہی اس قدر بلند مرتبت تھیں جو ان کی حیات ابدی کی ضامن بن جاتیں۔ دراصل میر انیس دور متوسط کے سب سے بڑے اردو رباعی گو شاعر ہیں۔ ان کی شیریں، پر درد اور بلند آواز صدیوں تک اردو رباعی کی فضا میں گونجتی رہے گی۔''

(اردو رباعیات، ڈاکٹر سلام سندیلوی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۶۳ء، ص ۳۷۹)

میر انیسؔ کی متانت و سنجیدگی اس امر سے بھی واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی مذہبی رباعیات کو دوسروں کے اعتقاد پر طعن و تشنیع کا آلہ نہیں بنایا بلکہ انھوں نے اختلافی امور میں صرف اپنے موقف کو ظاہر کیا ہے دوسروں کے اعتقاد سے بیجا تعریض نہیں کی ہے۔ اس سلسلے میں دوسرے رباعی گویوں سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے علی جواد زیدی نے انیس کی عظمت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اردو رباعیوں کی خاصی بڑی تعداد اعتقادی فضا کی پیداوار ہے۔ اس لیے خصوصی معتقدات کے اظہار سے گریز ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ حاتم و ہدایت وغیرہ نے جا بجا شیعہ اور سنی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے اس کا اظہار کیا ہے کہ ان اختلاف کے باوجود وہ ایک روادارانہ مسلک اختیار کیے ہوئے ہیں۔ مومن کے یہاں مسلک اہل حدیث سے سے شیفتگی بھی ہے اور اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ مقلدین پر طعن سے احتراز بھی نہیں کرتے۔ شیعی رباعی گویوں کے یہاں کلامیہ رجحانات کا بھی اظہار ہوا ہے۔ ایسے خصوصی اعتقادی مسائل سے ہماری رباعیوں کا دامن خالی تو نہیں ہے لیکن یہ بہت کم نظم ہوئے ہیں۔ انیس کے یہاں جہاں بھی ایسے حصے آئے ہیں وہ منفی اختلافی پہلوؤں سے یکسر عاری ہیں۔ وہ کبھی مطاعن کے قریب نہیں جاتے۔''

(رباعیات انیس، مرتب علی جواد زیدی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۵۵)

رباعیات انیسؔ کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں ایسا لہجہ و آہنگ پایا جاتا ہے جو دروں بینی اور خود کلامی کے انداز کی ہوتی ہیں۔ وہ خارجی حقائق کو بھی داخلی بنا لیتے ہیں جس ان کی رباعیات میں ایک خاص قسم کا تاثر پیدا ہو جاتا ہے جو سامعین پر سحر طاری کر دیتا ہے۔ ''وہ دل سے دل تک منتقل کرنے والے لہجے کو ترجیح دیتے ہیں اور دعوت و موعظت کے عامیانہ رویے سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔'' (ایضاً، ص ۵۷)

خلاصہ کلام ان تمام خصوصیات نے میر انیس کو مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ رباعی گوئی میں ایک ممتاز حیثیت عطا کر دی ہے جو انھیں کے ساتھ خاص ہے۔ اب ہم ان کے کلام میں موجود مختلف موضوعات کا جائزہ لیں گے جس سے مذکورہ بالا امور کی تائید بھی ہو جائے گی اور ان کے کلام کی تفہیم میں بھی سہولت ہوگی۔

مذہبی موضوعات

میر انیسؔ کی زیادہ تر رباعیات کا موضوع مذہب ہی ہے جس کے تحت انھوں نے حمد، نعت، منقبت اور اپنے معتقدات کا اظہار کیا ہے۔ ان رباعیات میں عقیدت، محبت، خلوص اور والہانہ جذبات کا بھرپور اظہار ملتا ہے

۔حمدیہ رباعیات میں انھوں نے اللہ کی ذات وصفات اوراس کی قدرت کومختلف انداز میں بیان کیا ہے جواس کی رزاقی،ستاری،غفاری، جودوکرم اورعفوودرگزرکوواضح کرتی ہیں:

حمد

حیراں ہے عقل ودل شیدا سب میں — دیکھوکہ ہے شان ہویدا سب میں
کیا قدرت معبود ہے اللہ اللہ — پنہاں سب میں ہے اور پیدا سب میں

عفوودرگزر

کب شاہ وگدا سے راہ رکھتا ہوں — تیری ہی طرف نگاہ رکھتا ہوں
بخشے مرے جرم تو نے لاکھوں یارب — رحمت کوتری گواہ رکھتا ہوں

نعت

دنیا میں محمد سا شہنشاہ نہیں — کس راز سے خلق کے یہ آگاہ نہیں
باریک ہے ذکرِ قربِ معراج رسول — خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں

منقبت

عرفاں تصدیق حجتِ حیدر ہے — ایماں نورِ محبت حیدر ہے
دوزخ ہے عداوتِ علی کا بدلہ — فردوس بہائے الفت حیدر ہے

یکتا گہر قلزم سرمد ہے حسین — سردار امم مثل محمد ہے حسین
جب سر کو قدم کیا تو طے کی رہ عشق — حقا کہ شہیدوں میں سرآمد ہے حسین

فضائل نجف اشرف

جو روضۂ حیدر پہ مکیں ہوتا ہے — واہ داخل فردوس بریں ہوتا ہے
یوں ہوگا بہشت میں نجف کا طبقہ — جس طرح کے خاتم میں نگیں ہوتا ہے

مذکورہ بالا تمام رباعیات کا تعلق معتقدات سے ہے جس میں حمد،نعت،منقبت حضرت علی،حضرت حسین اور نجف کے فضائل کو بیان کیا گیا ہے۔اس موضوع پر رباعیات خصوصی طور پر انیسؔ کے یہاں ہی ملتی ہیں۔ڈاکٹر سلام سندیلوی کے مطابق ''یہ موضوع میر انیسؔ کی خاص ایجاد ہے۔ان سے قبل اس قسم کی عقیدت مندی کے جذبات کا اظہار کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔''

(اردو رباعیات،ڈاکٹر سلام سندیلوی،نسیم بک ڈپو لکھنؤ،۱۹۶۳ء،ص ۳۶۹)

اخلاقی رباعیات

اردو رباعیات میں انیسؔ سے ماقبل حکمت وفلسفہ اور اخلاق وآداب کے موضوعات کو ہی فوقیت حاصل رہی ہے۔اس کی وجہ فارسی رباعی گوئی کی وہ مستحکم روایت رہی جس میں عموماً فلسفہ،تصوف اور اخلاق کے مضامین کی کثرت پائی جاتی ہے۔اسی کے پیش نظر امداد امام اثر نے بھی اردو میں رباعی کے مضامین جلیلہ کی قید لگائی ہے۔وہ لکھتے ہیں ''شاعر کو لازم ہے کہ مسائل اخلاق وتمدن ومعاشرت ومذہب ودیگر مضامین جلیلہ سے اپنے کلام کو زینت دے۔اگر پست خیالی کی طرف اس کے کلام کا میلان ہوگا تو اس کی رباعی بامراد تاثیر پیدا نہ کر سکے گی۔''

(رباعیات انیس،ص۳۶)

چنانچہ جب ہم انیس کی رباعی کو اس محک پر کستے ہیں تو وہ اس پر بھی کھری اترتی ہیں۔ان کے یہاں مضامین جلیلہ کے علاوہ دیگر سطحی مضامین کو باندھا ہی نہیں گیا ہے بلکہ وہ اعلیٰ اخلاقی مضامین کا بیش بہا خزینہ ہیں جن میں ترک دنیا،فکر آخرت اور پند ونصائح کے مضامین کثرت سے پیش کیے گئے ہیں جو ایک مذہبی اور متمدن معاشرے کے لیے لابدی حیثیت رکھتے ہیں۔چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

انجام پہ اپنے آہ وزاری کرتو — سختی بھی جو ہو تو بردباری کرتو
پیدا کیا خاک سے خدا نے تجھ کو — بہتر ہے یہی کہ خاکساری کرتو

ضائع نہ کر آغوش کے پالے دل کو — کرتے ہیں پسند درد والے دل کو
درکار اگر ہے زادِ راہ عقبیٰ — سب چھوڑ کے،دنیا سے اٹھالے دل کو

یاں سے نہ کسی کو ساتھ لے جائیں گے — تنہا ہی لحد میں پاؤں پھیلائیں گے
کوئی نہ شریک حال ہوگا اپنا — وللہ بس اعمال ہی کام آئیں گے

شکل چمن صدق ووفا بگڑی ہے — ہے رنگ نیا بوئے وفا بگڑی ہے
پھولوں سے ہے پھولوں کو دغا کا کھٹکا — کیا گلشن عالم کی ہوا بگڑی ہے

مذکورہ بالا رباعیات کے مطالعہ یہ بات پوری طرح سے مبرہن ہو جاتی ہے کہ انیس کی رباعیات فنی طور پر اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ان میں قادر الکلامی،تخیل کی بلند پروازی،مطالعہ کی گہرائی وگیرائی،مشاہدے کی درّا کی بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔انیس کی رباعیات اردو ادب میں وقیع ترین اضافہ ہیں جن کی اہمیت ہمیشہ قائم ودائم رہے گی۔

11.3.3 میر انیس کی رباعیات کا تجزیہ

(۱) ہم نے کبھی عصیاں سے کنارہ نہ کیا — پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے جہنم کی بہت کی تدبیر — لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا

(۲) اندیشۂ باطل سحر و شام کیا — عقبیٰ کا نہ ہائے، کچھ سرانجام کیا
ناکام چلے جہاں سے افسوس، انیس! — کس کام کو یاں آئے تھے، کیا کام کیا

پہلی رباعی میں انیس نے اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر اور اس کی بے پایاں رحمت کا ذکر کیا ہے۔ انسان اپنی زندگی میں اللہ کے مقرر کردہ اوامر و نواہی کی پابندی سے مسلسل پہلو تہی کرتا رہتا ہے مگر رب العالین کی اپنے ستاری و غفاری سے نہ صرف اس کی عیب پوشی کرتا ہے بلکہ اس کے گناہوں کے باوجود اس کو ہر طرح کی نعمتوں سے سرفراز فرماتا رہتا ہے تاکہ بندہ آزردہ خاطر نہ ہو۔ اس کرم و عطا کے باوجود انسان مسلسل جہنم میں لے جانے والے اعمال سرانجام دیتا رہتا لیکن رب کریم پھر بھی اس کی مغفرت فرما دیتا کیونکہ وہ ایسی کریم ذات ہے جو اپنے گنہگار سے گنہگار بندے کی مغفرت فرما کر اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔

دوسری رباعی میں انیس نے انسان کو اس کا مقصد حیات یاد دلایا ہے کہ اے انساں! تو دنیا میں آ کر باطل قسم کے معاملات و مسائل میں شام و سحر الجھا ہوا ہے۔ جب کہ تجھے آخرت کی فکر کرنی چاہئے لیکن افسوس کہ تو اس معاملے میں ناکام رہا یعنی دنیاوی الجھیڑوں میں ایسا پھنسا کہ اپنے اصلی مقصد کو بھلا بیٹھا۔ تجھ پر صرف افسوس ہی کیا جا سکتا ہے کہ تو جس کام کے لیے دنیا میں آیا اس کو بھول کر دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا جو آخر کار تیرے لیے ہلاکت کا باعث ہوں گے۔

11.3.4 خلاصہ

میر ببر علی نام انیسؔ تخلص ۱۸۰۲ء میں بہ مقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ والد گرامی میر مستحسن خلیق اور جد میر حسن دہلوی (صاحب مثنوی سحر البیان) جو میر ضاحک کے صاحبزادے تھے گویا سارا خاندان علم و کمال کا حامل تھا۔ انیس کے پردادا میر ضاحک کا اصل نام سید غلام حسین تھا اور ان کا خاندان ہرات سے دلی میں آ کر آباد ہوا تھا۔ میر انیس کا والد میر مستحسن خلیق بھی شاعر تھے اور انھوں نے مرثیہ گوئی میں بہت شہرت پائی۔ میر ببر علی انیسؔ اسی مشہور خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔

میر انیسؔ کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی۔ جب وہ لکھنؤ منتقل ہوئے تو یہاں بھی انھوں نے نجی طور پر تعلیم حاصل کرنے کا مشغلہ جاری رکھا اور اپنی فطری ذہانت و فطانت سے رسمی تعلیم کی کمی کو حتیٰ المقدور پورا کرنے کی کوشش میں مشغول رہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ انھوں نے فنون سپہگری کی خوب مشق بہم پہنچائی۔

میر انیسؔ کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا اور رواج زمانہ کے مطابق انھوں نے بھی غزل سے شاعری کی ابتدا کی لیکن اپنے والد گرامی نصیحت کو قبول کرتے ہوئے انھوں نے غزل گوئی کو ترک کر دیا اس کے بعد

انھوں نے رثائی ادب میں وہ مقام حاصل کیا جہاں تک پہنچنا ایک مشکل ترین عمل ہے۔ واقعات کربلا اور اس سے متعلق چیزوں کو انھوں نے جس خوبی کے ساتھ ادب میں پیش کیا ہے وہ ان کے نابغۂ عصر ہونے کا بیّن ثبوت ہے ۔چنانچہ ان کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے ہندوستان کے مختلف شہروں سے انھیں مرثیہ خوانی کے لیے دعوت دی گئی جہاں ہزاروں کی تعداد میں سامعین نے براہ راست ان سے مراثی سنے۔اس سلسلے میں انھوں نے بنارس،الہ آباد، پٹنہ(عظیم آباد)اور حیدرآباد(دکن)وغیرہ کا سفر کیا۔انیسؔ نے اپنی شاعرانہ زندگی میں بہت بڑی تعداد میں مرثیے ،سلام ،نوحے اور رباعیات تخلیق کیں جو ان کو ادب میں ہمیشہ زندہ وجاوید رکھنے کے لیے کافی و وافی ہیں۔میر انیسؔ نے سن شعور سے تاحین حیات اس فن کی آبیاری کی اور آخر میں تپ دق اور دردسر کے امراض میں ایک ماہ مبتلا رہ کر ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۰ ستمبر ۱۸۷۴ء کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کی جانب کوچ کیا اور سبزی منڈی میں واقع اپنے باغ میں مدفون ہوئے۔

میر انیسؔ اردو کے سب سے بڑے مرثیہ گو ہیں۔انھوں نے واقعات کربلا اور اہل بیت اطہار کے تعلق سے اپنے عقائد اور اپنی عقیدت دونوں کو شاعری کی مختلف اصناف اور ہیئتوں میں بخوبی برتا ہے۔ان اصناف میں سے ایک ہیئتی اصناف رباعی بھی ہے۔انیسؔ نے اردو مرثیہ کے ساتھ ساتھ اردو رباعی گوئی کو بھی بام عروج تک پہنچادیا ہے۔اردو میں ان سے زیادہ متنوع الموضوعات رباعیات کسی دوسرے نے نہیں کہی ہیں۔ان کی رباعیات کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے لائق اعتنا ہیں۔انیسؔ سے ماقبل بھی اردو میں رباعی گوئی کی ایک مستحکم روایت موجود تھی۔خود مرثیہ گویوں کے یہاں مرثیہ سے پہلے رباعیات پیش کرنے کا رواج عام ہو چکا تھا۔انیسؔ نے بھی اسی روش کا تتبع کیا اور انھوں مرثیہ خوانی سے قبل پڑھنے کے لیے خصوصی طور پر رباعیات تحریر کیں۔

انیسؔ نے کم وبیش چھ سو رباعیات تحریر کی ہیں۔ان میں وہ تمام موضوعات پائے جاتے جو ان سے قبل رباعی گویوں نے برتے ہیں سوائے خمریات کہ انھوں نے اس کو مذہبی نقطۂ نظر سے مناسب نہیں سمجھا۔ان کے یہاں رباعیات میں بھی رثائی موضوعات ہی کی کثرت ہے۔انیسؔ سے ماقبل بھی رثائی موضوعات کو رباعی گوئی میں برتا جارہا تھا لیکن انھوں نے اس موضوع کو بطور خاص وسعت بخشا۔'مجموعۂ رباعیات انیس' کے مرتب سید محمد عباسی نے ان کی رباعیات کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:(۱)مذہبیات اس کے تحت انھوں نے حمد،نعت،منقبت،معتقدات اور مراثی کو شامل کیا ہے۔(۲)اخلاقیات (۳)ذاتیات۔ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ان کی رباعیات کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:مذہبی رباعیات،اخلاقی رباعیات،فلسفیانہ رباعیات،سماجی رباعیات،اور ذاتی رباعیات۔

میر انیسؔ کی مذہبی رباعیات اردو ادب میں ایک لائق قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔حمد،نعت، منقبت،عقائد،اور رثاء نے اردو شاعری میں نئے باب وا کیے۔معتقدات کے موضوع میں تو ان کو موجد کی حیثیت

حاصل ہے۔انیسؔ کے زیر اثر بہت سے مرثیہ گوشعرا نے بھی رباعی کی صنف میں طبع آزمائی شروع کی لیکن ان میں سے کوئی انیس کے رتبے کو نہیں پہنچ سکا۔ہاں بعض حضرات نے جزوی طور پر کچھ ایک آدھ موضوع میں ہی ان سے آگے بڑھ سکے مثلاً پیارے صاحب رشید نے ضعیفی کے موضوع پر انیسؔ سے بڑھ کر رباعیات کہی ہیں۔

حاصل کلام میر انیسؔ نے اپنی رباعیات میں جن موضوعات کو بھی برتا ہے ان کے ساتھ انصاف کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور ہر موضوع کے تحت تمام ذیلی مباحث کو حتی المقدور پیش کرنے کی سعیٔ احسن کی ہے ۔انیس کی قادرالکلامی ،فنی چابکدستی ،اصول کی پابندی اور متانت وسنجیدگی نے انھیں وہ رتبہ عطا کیا جو بہت کم شعرا کے حصے میں آیا۔ان کی مرثیہ گوئی تو کمال ہے ہی لیکن ان کی رباعی گوئی بھی کسی طرح مراثی سے کم درجے کی نہیں ہے۔

11.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ نے

میر انیس کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کی۔

میر انیس کی رباعی گوئی سے آگہی حاصل کی۔

میر انیس کی رباعیات کے موضوعات سے واقفیت حاصل کی۔

میر انیس کی رباعیات کا تجزیہ کیا۔

11.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1. میر انیس کے سوانحی کوائف مختصراً بیان کیجئے؟
2. میر انیس کی رباعیات کے موضوعات پر روشنی ڈالیں؟
3. میر انیس کی کسی ایک رباعی کا تجزیہ پیش کریں؟
4. میر انیس کی رباعی گوئی کے امتیازات کو مختصراً بیان کریں؟

11.6 سوالات کے جوابات

1. میر ببر علی نام انیسؔ تخلص ۱۸۰۲ء میں بہ مقام فیض آباد پیدا ہوئے۔والد گرامی میر مستحسن خلیق اور جد میر حسن دہلوی (صاحب مثنوی سحرالبیان) جو میر ضاحک کے صاحبزادے تھے گویا سارا خاندان علم وکمال کا حامل تھا۔ انیس کے پردادا میر ضاحک کا اصل نام سید غلام حسین تھا اور ان کا خاندان ہرات سے دلی میں آکر آباد ہوا تھا ۔میر انیس کا والد میر مستحسن خلیق بھی شاعر تھے اور انھوں نے مرثیہ گوئی میں بہت شہرت پائی۔میر ببر علی انیسؔ اسی مشہور خانوادے کے چشم وچراغ ہیں۔

میر انیسؔ کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی۔جب وہ لکھنؤ منتقل ہوئے تو یہاں بھی انھوں نے نجی طور پر

تعلیم حاصل کرنے کا مشغلہ جاری رکھا اور اپنی فطری ذہانت و فطانت سے رسمی تعلیم کی کمی کو حتیٰ المقدور پورا کرنے کی کوشش میں مشغول رہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ انھوں نے فنون سپہگری کی خوب مشق بہم پہنچائی۔

میر انیسؔ کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا اور رواج زمانہ کے مطابق انھوں نے بھی غزل سے شاعری کی ابتدا کی لیکن اپنے والد گرامی نصیحت کو قبول کرتے ہوئے انھوں نے غزل گوئی کو ترک کر دیا اس کے بعد انھوں نے رثائی ادب میں وہ مقام حاصل کیا جہاں تک پہنچنا ایک مشکل ترین عمل ہے۔ واقعات کربلا اور اس سے متعلق چیزوں کو انھوں نے جس خوبی کے ساتھ ادب میں پیش کیا ہے وہ ان کے نابغۂ عصر ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ چنانچہ ان کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے ہندوستان کے مختلف شہروں سے انھیں مرثیہ خوانی کے لیے دعوت دی گئی جہاں ہزاروں کی تعداد میں سامعین نے براہ راست ان سے مراثی سنے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بنارس، الہ آباد، پٹنہ (عظیم آباد) اور حیدر آباد (دکن) وغیرہ کا سفر کیا۔ انیسؔ نے اپنی شاعرانہ زندگی میں بہت بڑی تعداد میں مرثیے، سلام، نوحے اور رباعیات تخلیق کیں جو ان کو ادب میں ہمیشہ زندہ و جاوید رکھنے کے لیے کافی و وافی ہیں۔ میر انیسؔ نے سن شعور سے تاحین حیات اس فن کی آبیاری کی اور آخر میں تپ دق اور دردسر کے امراض میں ایک ماہ مبتلا رہ کر ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۰ ستمبر ۱۸۷۴ء کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کی جانب کوچ کیا اور سبزی منڈی میں واقع اپنے باغ میں مدفون ہوئے۔

2. میر انیس کی رباعیات میں وہ تمام موضوعات پائے جاتے ہیں جو ان سے قبل رباعی گویوں نے برتے ہیں سوائے خمریات کہ انھوں نے اس کو مذہبی نقطۂ نظر سے مناسب نہیں سمجھا۔ ان کے یہاں رباعیات میں بھی رثائی موضوعات ہی کی کثرت ہے۔ انیسؔ سے ماقبل بھی رثائی موضوعات کو رباعی گوئی میں برتا جا رہا تھا لیکن انھوں نے اس موضوع کو بطور خاص وسعت بخشا۔ 'مجموعۂ رباعیات انیس' کے مرتب سید محمد عباسی نے ان کی رباعیات کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں: (۱) مذہبیات اس کے تحت انھوں نے حمد، نعت، منقبت، معتقدات اور مراثی کو شامل کیا ہے۔ (۲) اخلاقیات (۳) ذاتیات۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ان کی رباعیات کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں: مذہبی رباعیات، اخلاقی رباعیات، فلسفیانہ رباعیات، سماجی رباعیات، اور ذاتی رباعیات۔

میر انیسؔ کی مذہبی رباعیات اردو ادب میں ایک لائق قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حمد، نعت، منقبت، عقائد، اور رثاء نے اردو شاعری میں نئے باب وا کیے۔ معتقدات کے موضوع میں تو ان کو موجد کی حیثیت حاصل ہے۔

3. اندیشۂ باطل سحر و شام کیا — عقبیٰ کا نہ ہائے، کچھ سرانجام کیا
ناکام چلے جہاں سے افسوس، انیس! — کس کام کو یاں آئے تھے، کیا کام کیا

اس رباعی میں انیس نے انسان کو اس کا مقصد حیات یاد دلایا ہے کہ اے انساں! تو دنیا میں آ کر باطل قسم کے معاملات و مسائل میں شام و سحر الجھا ہوا ہے۔ جب کہ تجھے آخرت کی فکر کرنی چاہئے لیکن افسوس کہ تو اس معاملے میں ناکام رہا یعنی دنیاوی الجھیڑوں میں ایسا پھنسا کہ اپنے اصلی مقصد کو بھلا بیٹھا۔ تجھ پر صرف افسوس ہی کیا جا سکتا ہے کہ تو جس کام کے لیے دنیا میں آیا اس کو بھول کر دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا جو آخر کار تیرے لیے ہلاکت کا باعث ہوں گے۔

4. میر انیسؔ اردو کے سب سے بڑے مرثیہ گو ہیں۔ انھوں نے واقعات کربلا اور اہل بیت اطہار کے تعلق سے اپنے عقائد اور اپنی عقیدت دونوں کو شاعری کی مختلف اصناف اور ہیئتوں میں بخوبی برتا ہے۔ ان اصناف میں سے ایک ہیئتی اصناف رباعی بھی ہے۔ انیسؔ نے اردو مرثیہ کے ساتھ ساتھ اردو رباعی گوئی کو بھی بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔ اردو میں ان سے زیادہ متنوع الموضوعات رباعیات کسی دوسرے نے نہیں کہی ہیں۔ ان کی رباعیات کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے لائق اعتنا ہیں۔ انیسؔ سے ماقبل بھی اردو میں رباعی گوئی کی ایک مستحکم روایت موجود تھی۔ خود مرثیہ گویوں کے یہاں مرثیہ سے پہلے رباعیات پیش کرنے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ انیسؔ نے بھی اسی روش کا تتبع کیا اور انھوں مرثیہ خوانی سے قبل پڑھنے کے لیے خصوصی طور پر رباعیات تحریر کیں۔

انیسؔ نے کم و بیش چھ سو رباعیات تحریر کی ہیں۔ ان میں وہ تمام موضوعات پائے جاتے جو ان سے قبل رباعی گویوں نے برتے سوائے خمریات کہ انھوں نے اس کو مذہبی نقطۂ نظر سے مناسب نہیں سمجھا۔ ان کے یہاں رباعیات میں بھی رثائی موضوعات ہی کی کثرت ہے۔ انیسؔ سے ماقبل بھی رثائی موضوعات کو رباعی گوئی میں برتا جا رہا تھا لیکن انھوں نے اس موضوع کو بطور خاص وسعت بخشا۔ 'مجموعۂ رباعیات انیس' کے مرتب سید محمد عباسی نے ان کی رباعیات کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں: (۱) مذہبیات اس کے تحت انھوں نے حمد ،نعت، منقبت، معتقدات اور مراثی کو شامل کیا ہے۔ (۲) اخلاقیات (۳) ذاتیات۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ان کی رباعیات کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں: مذہبی رباعیات، اخلاقی رباعیات، فلسفیانہ رباعیات، سماجی رباعیات، اور ذاتی رباعیات۔

میر انیسؔ کی مذہبی رباعیات اردو ادب میں ایک لائق قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حمد، نعت، منقبت، عقائد، اور رثاء نے اردو شاعری میں نئے باب وا کیے۔ معتقدات کے موضوع میں تو ان میں آیا۔ ان کی مرثیہ گوئی تو کمال ہے ہی لیکن ان کی رباعی گوئی بھی کسی طرح مراثی سے کم درجے کی نہیں ہے۔

11.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
جد	دادا

خَلَف	جانشین
نابغہ	عربی کا ایک مشہور شاعر، مشہور شخصیت
تاحین حیات	پوری زندگی
تپ ودق	ٹی۔بی کی بیماری
روش	راستہ، طریقہ
ماقبل	پہلے
حیات ابدی	ہمیشہ کی زندگی، باقی رہنے والی زندگی
ضامن	ضمانت دار، کسی کی ذمیداری لینا
طعن وتشنیع	برا بھلا کہنا
تعریض	چھیڑ چھاڑ
معتقدات	عقیدہ یا ایمان سے تعلق رکھنے والی چیزیں
شیفتگی	محبت، عشق
احتراز	بچنا، گریز کرنا
عاری	خالی
مطاعن	طعن کی جگہ، بری جگہ
دوں بینی	باطن میں جھانکنا
خودکلامی	اپنے آپ سے بات کرنا
والہانہ	محبت یا عقیدت کے ساتھ
ہویدا	ظاہر، نظر آنے والا
پنہاں	پوشیدہ، چھپا ہوا

11.8 کتب برائے مطالعہ

1. رباعیات انیس	علی جواد زیدی
2. میر انیس	ڈاکٹر نیر مسعود
3. انیس شخصیت اور فن	فضل امام
4. موازنۂ انیس ودبیر	علامہ شبلی نعمانی
5. میر انیس	کلیم الدین احمد

اکائی12. اکبرالہ آبادی: حیات اور رباعی گوئی

ساخت

12.1 اغراض ومقاصد

12.2 تمہید

12.3 اکبرالہ آبادی: حیات اور رباعی گوئی

12.3.1 اکبرالہ آبادی: سوانحی کوائف

12.3.2 اکبرالہ آبادی کی رباعی گوئی

12.3.3 اکبرالہ آبادی کی رباعیات کا تجزیہ

12.3.4 خلاصہ

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

12.5 اپنا امتحان خود لیجئے

12.6 سوالات کے جوابات

12.7 کلیدی الفاظ

12.8 کتب برائے مطالعہ

12.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کرنے کے بعد آپ

اکبرالہ آبادی کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کریں گے۔

اکبرالہ آبادی کی رباعی نگاری سے متارف ہوں گے۔

اکبرالہ آبادی کی رباعیات کا تجزیہ کر کے اسے سمجھیں گے۔

12.2 تمہید

طلبائے گرامی! آپ گزشتہ اکائی میں میر انیس کے سوانحی کوائف اور ان کی رباعی گوئی سے آگاہ ہوئے اب اس اکائی میں آپ اکبرالہ آبادی کے سوانحی کوائف سے آشنا ہوں گے اور ان کی رباعی گوئی سے بحث کریں گے۔ان کی رباعیات کے امتیازات کو سمجھیں گے۔

12.3 اکبرالہ آبادی: حیات اور رباعی گوئی

12.3.1 اکبرالہ آبادی: سوانحی کوائف

اکبرالہ آبادی نے ایسے زمانے میں آنکھ کھولی جب انگریز ہندوستان میں اپنے پیر جمارہے تھے۔ یہ پہلی جنگ ۱۸۵۷ء سے ایک دہائی پہلے کا زمانہ ہے۔اس زمانے میں پورے ہندوستان میں بڑی عجیب وغریب قسم کی کش مکش جاری تھی ایک طرف انگریز یہاں قابض ہونے کی کوشش کررہے تھے وہیں دوسری طرف مجاہدین آزادی ان کو یہاں سے نکالنے کے لئے اپنے تن، من اور دھن کی بازی لگائے ہوئے تھے۔لیکن بدقسمتی سے ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی مجاہدوں کوشکست ہوئی اور پورے ہندوستان پر انگریز قابض ہوگئے۔اس کے بعدانھوں نے ہندوستان میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے اپنانے شروع کئے۔ ہندوستانی عوام اس ظالم و جابر حکومت کے سامنے بے بس و لاچار ہوگئی تھی۔انگریزوں نے جب ہندوستانیوں پر اپنی تہذیب لادنے کی کوشش کی تو بہت سے لوگ پیسے اور عہدے کی لالچ میں اس کے دلدادہ ہونے لگے اورانھوں نے مشرقی تہذیب کو غیر ترقی یافتہ اور خراب سمجھنا شروع کردیا۔گویا یہ زمانہ دوتہذیبوں کے درمیان کش مکش کا زمانہ تھا۔لوگ مغربی کی طرف دیوانہ وار بڑھ رہے تھے اور مشرق سے بیزاری کا اظہار کررہے تھے۔اس رویے نے ہندوستان میں ایک قسم کی بے راہ روی پیدا کردی۔

اس تہذیبی یلغار سے بچنے کے ہندوستان کے شعرا، ادبا اور مصلحین نے مختلف طریقے استعمال کئے۔کسی نے وعظ و پند کے ذریعے، کسی نے مضامین ومقالات کے ذریعے اور کسی نے شعروشاعری کے ذریعے اس کا مقابلہ کیا۔اکبرالہ آبادی نے طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ذریعے مغرب کے طور طریقے اوراس کی تہذیب کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ان کی پوری شاعری مغرب کی کورانہ تقلید کے خلاف ہے۔اکبرقوم کی اصلاح کے خواہاں تھے چنانچہ انھوں نے انگریزی حکومت اوراس کی تہذیب پرطنز ومزاح کے تیرونشتر سے رہ رہ کروار کیا۔

اکبرالہ آبادی کا اصل نام سید اکبرحسین تھا۔ان کا تعلق ضلع الہ آباد ایک قصبے بارہ سے تھا۔ان کے جداعلیٰ ایران (نیشاپور) سے ہندوستان آئے تھے۔ان کا نسب چھپن واسطوں سے امام علی رضا سے ملتا ہے۔اکبر کی پیدائش ۱۶؍نومبر ۱۸۴۶ء کو ہوئی۔ان کے والد کا نام سید تفضّل حسین تھا۔اکبر کا بچپن داؤدنگر ضلع گیا بہار میں گزرا۔ ۱۸۵۵ء میں ان کا خاندان الہ آباد آگیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔اکبرکی ابتدائی تعلیم ان گھر پر ہوئی۔ انھوں نے اپنے والد سے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔اکبر کو علم ریاضی سے خاصا لگاؤ تھا اوراس کی تعلیم بھی انھوں نے اپنے والد سے پائی تھی۔دس سال کی عمر میں ان کا داخلہ جمنا مشن اسکول میں کرایا گیا جہاں انھوں نے صرف سال بھر ہی تعلیم حاصل کی تھی کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے شروع ہوگئے اوران کی پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔پہلی جنگ آزادی کے بعد اکثر ہندوستانیوں کی مالی حالت خراب ہوگئی تھی اس میں اکبر کا

خاندان بھی تھا۔ مالی پریشانیوں نے اکبرؔ کو مزید تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی اجازت نہ دی تو وہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوگئے۔ اکبرؔ کے والد نے اپنے ایک دوست کے ذریعے ان کو عدالتی پروانہ نویسی کا فن سیکھنے پر رضامند کر لیا اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ان کو ۱۸۵۹ء میں الہ آباد کے مجسٹریٹ نے عارضی طور پر اپنے عدالتی کام کے لیے ملازم رکھ لیا لیکن یہ سلسلہ جلدی ہی منقطع ہوگیا۔ پھر انھیں دوسری جگہ بھی عارضی طور پر ملازمت ملی وہ بھی جلدی ہی چھوٹ گئی۔ اس کے بعد ان کو جمنا پل کی تعمیر کے سلسلے میں ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے دوران اکبرؔ برابر مطالعے اور حصول علم کے لیے کوشاں رہے۔ انھوں نے اس دوران کلکتہ یونیورسٹی کے میٹرک کا پورا نصاب پڑھ ڈالا۔ ان کو اس زمانے میں نائب تحصیل دار کی نوکری مل رہی تھی لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا بلکہ ان کا رجحان عدالتی نوکری کی طرف تھا۔ اکبرؔ کی پہلی شادی تقریباً سترہ سال کی عمر میں گھر والوں نے کرادی لیکن اکبرؔ اس شادی سے خوش نہ تھے اور وہ اس سے ذہنی طور پر الجھن کا شکار رہتے تھے آخر کار انھوں ۱۸۷۶ء میں اپنی پسند سے دوسری شادی کر لی جس سے ان کی زندگی میں کافی تبدیلیاں آئیں۔

۱۸۶۶ء میں وکالت کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد انھوں نے الہ آباد میں وکالت شروع کر دی۔ ۱۸۷۳ء میں انھوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا اور پھر وہاں وکالت کرنے لگے۔ ۱۸۸۰ء میں قائم مقام منصف کی حیثیت سے مرزا پور میں ان کا تقرر ہوا۔ بعد میں ہمیر پور اور خورجہ میں دوسرے درجہ کے منصف کی حیثیت سے بھیجے گئے۔ ۱۸۸۸ء میں سرسید کی سفارش سے ان کا تبادلہ بحیثیت سب جج علی گڑھ ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں اکبرؔ کو ترقی دے کر سیشن جج بنا دیا گیا۔ وہ یہ عہدہ حاصل کرنے والے پہلے ہندوستانی تھے۔ وہ بطور جج جون پور، بہرائچ، مین پوری اور سہارن پور میں رہے۔ عدالتی خدمات کے صلے میں ۱۸۹۲ء میں ان کو 'خان بہادر' کا خطاب ملا اور ہائی کورٹ میں جج کے عہدے کے لیے تجویز پیش ہوئی لیکن اکبر نے اپنی بیماری اور آنکھ کی بینائی کی کمزوری کی وجہ سے یہ عہدہ قبول نہیں کیا۔ ۱۹۰۳ میں انھوں نے قبل از وقت وظیفہ لے کر نوکری سے سبکدوشی اختیار کر لی۔ آخری ایام میں اکبرؔ کی زندگی کئی طرح کی بیماریوں اور گھریلو پریشانیوں کی بنا پر طرح طرح کی آزمائشوں سے دوچار رہی آخر کار ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مختصر علالت کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔

12.3.2 اکبرالہ آبادی کی رباعی گوئی

اکبرؔ الہ آبادی اردو ادب میں اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، نظم اور قطعہ نگاری پر انھوں نے خصوصی طور توجہ دی ہے۔ صنف رباعی ان کے یہاں ضمنی طور پر برتی گئی ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ صنف ان کے یہاں کمیت و کیفیت کے لحاظ سے دوں مرتبہ ٹھہرتی ہو۔ ان کے یہاں رباعیات کی تعداد ۲۶۰ تک پہنچتی ہے اور موضوعات کے اعتبار سے بھی ان میں تنوع پایا جاتا ہے۔ طنزیہ، مزاحیہ، سنجیدہ، فلسفیانہ، اخلاقی، معاشی معاشرتی، سیاسی اور تاریخی موضوعات کی

گونا گوئی پائی جاتی ہے۔ نیز انھوں نے پند ونصائح سے بھی کام لیا ہے اور اپنے زمانے کی تحریکات خصوصا سرسید تحریک اور مغرب کی اندھی تقلید پر خوب تنقید کی ہے اور میں زور پیدا کرنے کے لئے انگریزی الفاظ کا بھی کہیں کہیں استعمال کیا ہے۔

انھوں نے ایسی رباعیات بھی کہی ہیں جن میں ان کا سیاسی وسماجی شعور پوری طرح سے واضح ہوتا ہے۔ اس میں کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ سے زور پیدا کیا گیا ہے:

اونچانیّت کا اپنی زینار رکھنا — احباب سے صاف اپنا سینار رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر — لیکن ہے شدید عیب کینار رکھنا

اس پیڑ میں خوب ہی کٹھل آئے ہیں — ہر شاخ میں پانچ سات پھل آئے ہیں
اکبر نے کہا کہ ہم غریبوں کے لئے — نیچر کی طرف سے پارسل آئے ہیں

اکبر نے پیری کے تعلق سے بھی کچھ رباعیات کہی ہیں۔ جس سے ان کی مذہبی فکر پوری طرح آشکار ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ انسانی زندگی کے تین ہی مراحل ہوتے ہیں بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ بچپن میں آدمی جوانی اور بڑے ہونے کی تمنا کرتا ہے پھر جب جوانی آتی تو آدمی کو طاقت وقوت اور آزادی حاصل ہوتی ہے لیکن جب جوانی ڈھلنے لگتی ہے تو آدمی کے قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں اور اسے اپنے سامنے پیری کا ضعف اور آخر میں موت کا غم ستانے لگتا ہے۔ ہر آدمی اس بات کو جانتا ہے مگر اس کا دل اسے قبول کرنے میں شش وپنج کا شکار رہتا ہے۔ اکبر نے اپنی اس رباعی اسی حیات فانی کا نقشہ کھینچا ہے:

پیری آئی ہوئی جوانی رخصت — ساتھ اس کے وہ لطف زندگانی رخصت
ہے اب تو اسی کا انتظار اے اکبر — ہم کو بھی کرے جہانِ فانی رخصت

اکبر سائنسی ترقی کے مخالف نہ تھے مگر اس کے ساتھ وہ ایک مذہبی شخص بھی تھے اور وہ روح کی حقیقت کے قائل تھے۔ ان کا یہ ایمان تھا تمام جاندار چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے روح پھونکی ہے جس وہ چیز زندہ اور کارآمد ہوتی ہے لیکن کچھ سائنس داں جو خدا کی ذات کے قائل نہیں ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ تمام چیزوں کی اصل مادہ ہے۔ اور مادہ قدیم اور ازلی ہے اسے کسی نے نہیں بنایا بلکہ وہ ہمیشہ سے موجود ہے اور ہر چیز اسی سے نکلی یا بنی ہے۔ اکبر اس دعوے پر سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے ہر شے کی اصل مادہ تو یہ سوال تب بھی باقی رہتا ہے اس مادے میں یہ شعور کہاں سے پیدا ہوا کہ وہ اتنی بڑی کائنات بنادے اور اس کا انتظام وانصرام اس خوبی سے چلتا بھی رہے یہ بات خالق کو مانے بغیر ممکن نہیں ہے تمام چیزیں اس کے امر یعنی روح سے ہی چلتی ہیں۔ اکبر اپنی اس رباعی میں مادیت پرست لوگوں کے دعویٰ کی تردید کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں:

منکر ہیں روح کے جو یہ اہل غرور　　اک امر ہے پوچھنا ہمیں ان سے ضرور
ہے فہم وخرد کا تم کو دعویٰ یہ کہو　　پیدا ہوا مادے میں کیوں کر یہ شعور

اخلاقیات بھی مذہبی تعلیم ہی کا ایک جزو ہے۔اور حقیقت میں مذہب کے بغیر اخلاقیات کوئی معنیٰ نہیں رکھتیں۔مگر بعض لوگ جو مذہب کے قائل نہیں ہیں وہ بھی اخلاقیات کی ضرورت کے منکر نہیں ہیں اس لئے کہ انسانی معاشرے میں رہنے اور بقائے باہمی کے لئے اس کا ہونا ناگزیر ہے۔اس لئے ہر زمانے میں دنیا کے صاحبانِ علوم وفنون نے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور انسانی معاشرے کے لئے اس کو واجب قرار دیا ہے۔اکبؔر بھی مذہب کے زیر اثر اس کے قائل بھی ہیں اور مبلغ بھی۔چنانچہ وہ اپنی اس رباعی میں اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو دوسروں میں تقسیم کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر　　دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو　　جو اہل ہیں اس کے ان کی تعظیم بھی کر

کہہ دو کہ میں خوش ہوں رکھوں گر آپ کو خوش　　بجلی چمکاروں اور کروں بھاپ کو خوش
سیکھوں ہر علم وفن مگر فرض یہ ہے　　ہر حال میں رکھوں اپنے ماں باپ کو خوش

مغرب کی اندھی تقلید پر تنقید کرنا اکبر کا پسندیدہ موضوع ہے۔وہ جتنے سچے مسلمان تھے اتنے ہی پکے مشرقی بھی۔وہ اس بات سے ہمیشہ نالاں رہے کہ ہندوستان کے نوجوان بنا سوچے سمجھے انگریزی تہذیب کے اندھے مقلّد بن جاتے ہیں اور بسا اوقات وہ مضحکہ خیز بھی لگتے ہیں۔اکبؔر ایسے لوگوں کے لئے مغرب ہی کے ایک مفکر کا قول پیش کر رہے ہیں کہ تم لاکھ مغربی بننے کی کوشش کرو مگر وہ تمہیں کبھی اپنے برابر نہیں سمجھیں گے اس لئے کہ غالب قوم کبھی مغلوب کو برابری کا درجہ نہیں دیتی اگر تم ان کی برابری کرنا چاہتے ہو تو اپنی وضع پر قائم رہتے ہوئے علم وفن اور سائنس وتکنیک میں وہ مقام حاصل کرو کہ دنیا تمہارے ہنر کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جائے:

بل کھاؤ ہزار، خواہ چھانٹو منطق　　نیچر تو ہے اپنی اصل پر عاشق
لکھی ہے صحیح اک فرنگی نے یہ بات　　مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق

اکبؔر کی رباعیات میں موضوعات کا تنوع تو ملتا ہے اور انھوں نے اپنی رباعیات میں زور پیدا کرنے لئے طنز ومزاح اور انگریزی الفاظ کا بخوبی استعمال تو کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی رباعیات بہت پرکشش نہیں معلوم ہوتیں اور نہ ہی ان میں نغمگی کا عنصر ہی ملتا ہے کہ اسے گایا یا گنگنایا جا سکے۔بلکہ وہ بے ربط اور اکھڑی اکھڑی سی معلوم ہوتی ہیں۔نہ ہی ان کی رباعیات میں کوئی کہانی یا پلاٹ ہوتا ہے اور نہ کسی طرح کی ڈرامائیت جو ان کی رباعیات کو فن کے اعلیٰ مقام پر فائز کر سکے۔

12.3.3 اکبرالہ آبادی کی رباعیات کا تجزیہ

(۱) الفت، ادب نہیں تو انسان نہیں — بے صبر وسکوں جو ہو تو ایمان نہیں
جو غیر خدا کو مانتا ہو قادر — اکبؔر بخدا کہ وہ مسلمان نہیں

اکبر اس رباعی میں ادب، ایمان اور توحید کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ لوگوں کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ انسان کے اندر الفت ومحبت اور ادب وتہذیب کا ہونا لابدی اگر کسی انسان میں یہ صفات نہیں ہیں ایسا شخص انسان کہلانے کے لائق ہی نہیں ہے۔ اسی طرح جس انسان کے اندر صبر وسکون کا مادہ نہ اور مسلمان کہلانے کے لائق ہی نہیں ہے کیونکہ اللہ کے فیصلوں کو حق اور سچ سمجھنے والا کبھی بے صبر وسکون نہیں ہوسکتا۔ نیز جو شخص اللہ کے علاوہ کسی کو قادر مطلق سمجھتا یا جانتا ہو وہ آدمی صاحب ایمان نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ہر شے کا مالک وخالق صرف اللہ ہی ہے۔ اس کے سوا کسی کو قادر ماننے والا صاحب ایمان نہیں ہوسکتا۔

(۲) اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو — اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبؔر — بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

اکبر کی یہ رباعی رجائی پیغام دیتی ہے۔ اس میں وہ یہ درس دے رہے کہ انسان کو ہر حال میں امید رہنا چاہیے۔ انسان کو اولاً نیک اعمال سے اپنے آپ کو سجانا سنوارنا چاہیے۔ ظاہری حسن سے زیادہ باطنی حسن پر توجہ دینی چاہیے۔ اور اگر نیک راہ چلتے ہوئے کوئی آزمائش بھی آجائے تو انسان کو اللہ سے امید رکھنی چاہیے کہ وہ اس کو اس پریشانی سے نجات دیگا۔ اسی طرح موت ایک مسلمہ حقیقت ہے موت کے خوف سے اپنی زندگی کو اجیرن بنانا اور ہر وقت برے خیالات کا اندیشہ رکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ نیک اعمال کے ساتھ اللہ کے حضور پیش ہونے کے لئے بھی ہر دم خوشی کے ساتھ تیار رہنا چاہیے۔

12.3.4 خلاصہ

اکبرالہ آبادی کا اصل نام سید اکبر حسین تھا۔ ان کا تعلق ضلع الہ آباد ایک قصبے بارہ سے تھا۔ ان کے جد اعلیٰ ایران (نیشاپور) سے ہندوستان آئے تھے۔ اکبر کی پیدائش ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید تفضّل حسین تھا۔ اکبر کا بچپن داؤدنگر ضلع گیا بہار میں گزرا۔ ۱۸۵۵ء میں ان کا خاندان الہ آباد آگیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم ان گھر پر ہوئی۔ انھوں نے اپنے والد سے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اکبر کو علم ریاضی سے خاصا لگاؤ تھا اور اس کی تعلیم بھی انھوں نے اپنے والد سے پائی تھی۔ دس سال کی عمر میں ان کا داخلہ جمنا مشن اسکول میں کرایا گیا جہاں انھوں نے صرف سال بھر ہی تعلیم حاصل کی تھی کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے شروع ہوگئے اور ان کی پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ مالی پریشانیوں نے اکبر کو مزید تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی اجازت نہ دی تو وہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوگئے۔ اکبر کے والد نے اپنے ایک

دوست کے ذریعے ان کو عدالتی پروانہ نویسی کا فن سیکھنے پر رضامند کرلیا اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ان کو ۱۸۵۹ء میں الہ آباد کے مجسٹریٹ نے عارضی طور پر اپنے عدالتی کام کے لیے ملازم رکھ لیا لیکن یہ سلسلہ جلدی ہی منقطع ہو گیا۔ پھر انھیں دوسری جگہ بھی عارضی طور پر ملازمت ملی وہ بھی جلدی ہی چھوٹ گئی۔ اس کے بعد ان کو جمنا پل کی تعمیر کے سلسلے میں ملازمت مل گئی۔ اکبر کی پہلی شادی تقریباً سترہ سال کی عمر میں گھر والوں نے کرادی لیکن اکبر اس شادی سے خوش نہ تھے اور وہ اس سے ذہنی طور پر الجھن کا شکار رہتے تھے آخر کار انھوں ۱۸۷۶ء میں اپنی پسند سے دوسری شادی کر لی جس سے ان کی زندگی میں کافی تبدیلیاں آئیں۔

۱۸۶۶ء میں وکالت کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد انھوں نے الہ آباد میں وکالت شروع کر دی۔ ۱۸۷۳ء میں انھوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا اور پھر وہاں وکالت کرنے لگے۔ ۱۸۸۰ء میں قائم مقام منصف کی حیثیت سے مرزا پور میں ان کا تقرر ہوا۔ بعد میں ہمیر پور اور خورجہ میں دوسرے درجہ کے منصف کی حیثیت سے بھیجے گئے۔ ۱۸۸۸ء میں سرسید کی سفارش سے ان کا تبادلہ بحیثیت سب جج علی گڑھ ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں اکبر کو ترقی دے کر سیشن جج بنا دیا گیا۔ وہ یہ عہدہ حاصل کرنے والے پہلے ہندوستانی تھے۔ وہ بطور جج جون پور، بہرائچ، مین پوری اور سہارن پور میں رہے۔ عدالتی خدمات کے صلے میں ۱۸۹۲ء میں ان کو 'خان بہادر' کا خطاب ملا اور ہائی کورٹ میں جج کے عہدے کے لیے تجویز پیش ہوئی لیکن اکبر نے اپنی بیماری اور آنکھ کی بینائی کی کمزوری کی وجہ سے یہ عہدہ قبول نہیں کیا۔ ۱۹۰۳ میں انھوں نے قبل از وقت وظیفہ لے کر نوکری سے سبکدوشی اختیار کر لی۔ آخری ایام میں اکبر کی زندگی کئی طرح کی بیماریوں اور گھریلو پریشانیوں کی بنا پر طرح طرح کی آزمائشوں سے دوچار رہی آخر کار ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مختصر علالت کے بعد ان کی وفات ہو گئی۔

اکبر الہ آبادی اردو ادب میں اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی جانے جاتے ہیں۔ انھوں شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، نظم اور قطعہ نگاری پر انھوں نے خصوصی طور توجہ دی ہے۔ صنف رباعی ان کے یہاں ضمنی طور پر برتی گئی ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ صنف ان کے یہاں کمیت و کیفیت کے لحاظ سے دوں مرتبہ ٹھہرتی ہو۔ ان کے یہاں رباعیات کی تعداد ۲۶۰ تک پہنچتی ہے اور موضوعات کے اعتبار سے بھی ان میں تنوع پایا جاتا ہے۔ طنزیہ، مزاحیہ، سنجیدہ، فلسفیانہ، اخلاقی، معاشی معاشرتی، سیاسی اور تاریخی موضوعات کی گونا گوئی پائی جاتی ہے۔ نیز انھوں نے پند و نصائح سے بھی کام لیا ہے اور اپنے زمانے کی تحریکات خصوصا سرسید تحریک اور مغرب کی اندھی تقلید پر خوب تنقید کی ہے اور میں زور پیدا کرنے کے لئے انگریزی الفاظ کا بھی کہیں کہیں استعمال کیا ہے۔

انھوں نے ایسی رباعیات بھی کہی ہیں جن میں ان کا سیاسی و سماجی شعور پوری طرح سے واضح ہوتا ہے جس میں کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ سے زور پیدا کیا گیا ہے، اکبر نے مغرب کی اندھی تقلید اور مسلمانوں کی بے

راہ روی خوب ہدف تنقید بنایا ہے۔وہ ایک خالص مشرقی اور دینی معاشرے کے قیام کے لئے زندگی بھر کوشاں رہےاوراپنی رباعیات میں بھی انھوں نے یہی پیغام بار بار دیا ہے۔

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اکبرالہ آبادی کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کی۔

اکبرالہ آبادی کی رباعی گوئی سے آگہی حاصل کی۔

اکبرالہ آبادی کی رباعیات کے موضوعات سے واقفیت حاصل کی۔

اکبرالہ آبادی کی رباعیات کا تجزیہ کیا۔

12.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1. اکبرالہ آدی کے سوانحی کوائف مختصراً بیان کیجئے؟
2. اکبرالہ آبادی کی رباعیات کے موضوعات پر روشنی ڈالیں؟
3. اکبرالہ آبادی کی کسی ایک رباعی کا تجزیہ پیش کریں؟
4. اکبرالہ آبادی کی رباعی گوئی کے امتیازات کومختصراً بیان کریں؟

12.6 سوالات کے جوابات

1. اکبرالہ آبادی کا اصل نام سید اکبر حسین تھا۔ان کا تعلق ضلع الہ آباد ایک قصبے بارہ سے تھا۔ان کے جد اعلیٰ ایران (نیشاپور) سے ہندوستان آئے تھے۔اکبر کی پیدائش ۱۶؍نومبر ۱۸۴۶ء کو ہوئی۔ان کے والد کا نام سید تفضّل حسین تھا۔اکبر کا بچپن داؤدنگر ضلع گیا بہار میں گزرا۔۱۸۵۵ء میں ان کا خاندان الہ آباد آ گیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔اکبر کی ابتدائی تعلیم ان گھر پر ہوئی۔انھوں نے اپنے والد سے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔اکبر کو علم ریاضی سے خاصا لگاؤ تھا اور اس کی تعلیم بھی انھوں نے اپنے والد سے پائی تھی۔دس سال کی عمر میں ان کا داخلہ جمنا مشن اسکول میں کرایا گیا جہاں انھوں نے صرف سال بھر ہی تعلیم حاصل کی تھی کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے شروع ہو گئے اور ان کی پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔مالی پریشانیوں نے اکبر کو مزید تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی اجازت نہ دی تو وہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔اکبر کے والد نے اپنے ایک دوست کے ذریعے ان کو عدالتی پروانہ نویسی کا فن سیکھنے پر رضا مند کر لیا اس سے فائدہ ہوا کہ ان کو ۱۸۵۹ء میں الہ آباد کے مجسٹریٹ نے عارضی طور پر اپنے عدالتی کام کے لیے ملازم رکھ لیا لیکن یہ سلسلہ جلدی ہی منقطع ہو گیا۔پھر انھیں دوسری جگہ بھی عارضی طور پر ملازمت ملی وہ بھی جلدی ہی چھوٹ گئی۔پھر ان کو جمنا پل کی تعمیر کے سلسلے میں ملازمت مل گئی۔اکبر کی پہلی شادی تقریباً سترہ سال کی عمر میں گھر والوں نے کرادی لیکن اکبر اس شادی سے خوش نہ تھے اور وہ اس سے ذہنی طور پر الجھن کا شکار رہتے تھے آخر کار انھوں ۱۸۷۶ء میں اپنی پسند سے

دوسری شادی کر لی جس سے ان کی زندگی میں کافی تبدیلیاں آئیں۔

۱۸۶۶ء میں وکالت کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد انھوں نے الہ آباد میں وکالت شروع کر دی۔۱۸۷۳ء میں انھوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا اور پھر وہاں وکالت کرنے لگے۔۱۸۸۰ء میں قائم مقام منصف کی حیثیت سے مرزا پور میں ان کا تقرر ہوا۔بعد میں ہمیر پور اور خورجہ میں دوسرے درجہ کے منصف کی حیثیت سے بھیجے گئے۔۱۸۸۸ء میں سرسید کی سفارش سے ان کا تبادلہ بحیثیت سب جج علی گڑھ ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں اکبر کو ترقی دے کر سیشن جج بنا دیا گیا۔وہ یہ عہدہ حاصل کرنے والے پہلے ہندوستانی تھے۔وہ بطور جج جون پور، بہرائچ، مین پوری اور سہارن پور میں رہے۔عدالتی خدمات کے صلے میں ۱۸۹۲ء میں ان کو 'خان بہادر' کا خطاب ملا اور ہائی کورٹ میں جج کے عہدے کے لیے تجویز پیش ہوئی لیکن اکبر نے اپنی بیماری اور آنکھ کی بینائی کی کمزوری کی وجہ سے انھوں نے یہ عہدہ قبول نہیں کیا۔۱۹۰۳ میں انھوں نے قبل از وقت وظیفہ لے کر نوکری سے سبکدوشی اختیار کر لی۔آخری ایام میں اکبر کی زندگی کئی طرح کی بیماریوں اور گھریلو پریشانیوں کی بنا پر طرح طرح کی آزمائشوں سے دوچار رہی آخر کار ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء میں مختصر علالت کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔

2. اکبر کے یہاں رباعیات کی تعداد ۲۶۰ تک پہنچتی ہے اور موضوعات کے اعتبار سے بھی ان میں تنوع پایا جاتا ہے۔طنزیہ، مزاحیہ، سنجیدہ، فلسفیانہ، اخلاقی، معاشی معاشرتی، سیاسی اور تاریخی موضوعات کی گونا گوئی پائی جاتی ہے۔نیز انھوں نے پند و نصائح سے بھی کام لیا ہے اور اپنے زمانے کی تحریکات خصوصا سرسید تحریک اور مغرب کی اندھی تقلید پر خوب تنقید کی ہے اور میں زور پیدا کرنے کے لئے انگریزی الفاظ کا بھی کہیں کہیں استعمال کیا ہے۔

انھوں نے ایسی رباعیات بھی کہی ہیں جن میں ان کا سیاسی و سماجی شعور پوری طرح سے واضح ہوتا ہے جس میں کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ سے زور پیدا کیا گیا ہے۔

3.(ا) الفت، ادب نہیں تو انسان نہیں — بے صبر و سکوں جو ہو تو ایمان نہیں
جو غیر خدا کو مانتا ہو قادر — اکبر بخدا کہ وہ مسلمان نہیں

اکبر اس رباعی میں ادب، ایمان اور توحید کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ لوگوں کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ انسان کے اندر الفت و محبت اور ادب و تہذیب کا ہونا لابدی اگر کسی انسان میں یہ صفات نہیں ہیں ایسا شخص انسان کہلانے کے لائق ہی نہیں ہے۔اسی طرح جس انسان کے اندر صبر و سکون کا مادہ نہ اور مسلمان کہلانے کے لائق ہی نہیں ہے کیونکہ اللہ کے فیصلوں کو حق اور سچ سمجھنے والا کبھی بے صبر و سکون نہیں ہو سکتا۔نیز جو شخص اللہ کے علاوہ کسی کو قادر مطلق سمجھتا یا جانتا ہو وہ آدمی صاحب ایمان نہیں ہو سکتا۔کیونکہ ہر شے کا مالک و خالق صرف اللہ ہی ہے۔اس کے سوا کسی کو قادر ماننے والا صاحب ایمان نہیں ہو سکتا۔

4. اکبرالہ آبادی اردو ادب میں اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی جانے جاتے ہیں۔انھوں شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔غزل،نظم اور قطعہ نگاری پر انھوں نے خصوصی طور توجہ دی ہے۔صنف رباعی ان کے یہاں ضمنی طور پر برتی گئی ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ صنف ان کے یہاں کمیت و کیفیت کے لحاظ سے دوں مرتبہ ٹھہرتی ہو۔ان کے یہاں رباعیات کی تعداد ۲۶۰ تک پہنچتی ہے اور موضوعات کے اعتبار سے بھی ان میں تنوع پایا جاتا ہے۔طنزیہ،مزاحیہ،سنجیدہ،فلسفیانہ،اخلاقی،معاشی معاشرتی،سیاسی اور تاریخی موضوعات کی گونا گوئی پائی جاتی ہے۔نیز انھوں نے پند ونصائح سے بھی کام لیا ہے اور اپنے زمانے کی تحریکات خصوصا سرسید تحریک اور مغرب کی اندھی تقلید پر خوب تنقید کی ہے اور میں زور پیدا کرنے کے لئے انگریزی الفاظ کا بھی کہیں کہیں استعمال کیا ہے۔

انھوں نے ایسی رباعیات بھی کہی ہیں جن میں ان کا سیاسی وسماجی شعور پوری طرح سے واضح ہوتا ہے جس میں کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ سے زور پیدا کیا گیا ہے،اکبر نے مغرب کی اندھی تقلید اور مسلمانوں کی بے راہ روی خوب ہدف تنقید بنایا ہے۔وہ ایک خالص مشرقی اور دینی معاشرے کے قیام کے لئے زندگی بھر کوشاں رہے اور اپنی رباعیات میں بھی انھوں نے یہی پیغام بار بار دیا ہے۔

12.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
ہتھکنڈا	دانو،چالاکی،دھوکہ
یلغار	حملہ
دوں مرتبہ	حقیر،کم قیمت
تنوّع	مختلف قسم کا،طرح طرح کا
قویٰ	قوت،طاقت،توانائی
لابدی	جس سے چھٹکارا نہ ہو،ضروری
مسلّمہ	تسلیم شدہ،جس بات کو سب مانے

12.8 کتب برائے مطالعہ

1. کلیات اکبر	ڈاکٹر احمد محفوظ
2. رباعیات اکبر	مرتب عادل اسیر دہلوی
3. اکبرالہ آبادی	خواجہ محمد زکریا
4. رقعات اکبر	ساحل احمد

5.اکبرنامہ عبدالماجددریاآبادی

اکائی13. امجد حیدر آبادی: حیات اور رباعی گوئی

ساخت

13.1 اغراض ومقاصد

13.2 تمہید

13.3 امجد حیدر آبادی: حیات اور رباعی گوئی

13.3.1 امجد حیدر آبادی: سوانحی کوائف

13.3.2 امجد حیدر آبادی کی رباعی گوئی

13.3.3 امجد حیدر آبادی کی رباعیات کا تجزیہ

13.3.4 خلاصہ

13.4 آپ نے کیا سیکھا؟

13.5 اپنا امتحان خود لیجئے

13.6 سوالات کے جوابات

13.7 کلیدی الفاظ

13.8 کتب برائے مطالعہ

13.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کرنے کے بعد آپ

امجد حیدر آبادی کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کریں گے۔

امجد حیدر آبادی کی رباعی نگاری سے متارف ہوں گے۔

امجد حیدر آبادی کی رباعیات کا تجزیہ کر کے اسے سمجھیں گے۔

13.2 تمہید

طلبائے گرامی ! آپ گزشتہ اکائی میں اکبر الہ آبادی کے سوانحی کوائف اور ان کی رباعی گوئی سے آگاہ ہوئے اب اس اکائی میں آپ امجد حیدر آبادی کے سوانحی کوائف سے آشنا ہوں گے اور ان کی رباعی گوئی سے بحث کریں گے۔ان کی رباعیات کے امتیازات کو سمجھیں گے۔

13.3 امجد حیدر آبادی: حیات اور رباعی گوئی

13.3.1 امجد حیدر آبادی: سوانحی کوائف

امجد حیدر آبادی اصل نام ابوالاعظم سید امجد حسین تھا۔ان کے والد گرامی صوفی سید رحیم علی بن سید کریم الدین ایک متبع شریعت اور متقی شخص تھے۔امجد ۱۸۸۶ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے ابھی وہ چالیس دن کے ہوئے تھے کہ ان کے والد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔امجد کی پرورش و پرداخت ان کی والدہ گرامی نے کی۔جو ایک نیک طینت اور مذہبی خاتون تھیں۔انھوں نے امجد کی تربیت کا بھرپور خیال رکھا۔ایک موقع پر انھوں نے امجد کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر دنیا میں جینا ہے تو کچھ ہو کر جیو ورنہ مر جاؤ'' ایک اور واقعہ امجد نے خود بیان کیا ہے کہ ''چھ سال کی عمر میں جامعہ نظامیہ شریک کروایا گیا۔ہم صبح نو بجے گھر سے بستہ اٹھائے بغل میں لٹکائے ادھر ادھر گھوم کر شام چار بجے گھر واپس آتے۔ہماری اس آوارگی کی خبر گھر والوں کو ہوئی۔ایک دن ہمارے گھر کے سامنے سے کوئی امیر نواب کہاروں کے کندھوں پر پالکی میں جا رہے تھے۔پالکی کے ساتھ ساتھ ایک پیدل پاؤں دوڑ رہا ہے۔ماں نے کہا بتاؤ دونوں میں سے تم کو کس کی زندگی پسند ہے ہم نے کہا پالکی سوار کی۔والدہ نے کہا ایسی زندگی تو بغیر علم کے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی۔اگر نہ پڑھو گے تو تم کو بھی اسی دوسرے آدمی کی طرح پالکی کے ساتھ دوڑنا پڑے گا۔وقت کی بات گفتگو کا اثر اس بیش بہا مثال سے ہم بہت سہم گئے اور آئندہ کھیلنے سے توبہ کر کے پڑھنے لکھنے کا عہد کر لیا۔'' (کلیات امجد، ص ۱۵)

امجد کی ابتدائی تعلیم جامعہ نظامیہ میں ہوئی اسی دوران انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل، مولوی فاضل امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کر لی تھی۔۱۵ سال کی عمر میں انھوں نے عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ فن خطاطی اور علم العروض میں کامل دستگاہ حاصل کر لی تھی اور شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں محض انیس سال کی عمر میں ان کا پہلا رباعیات کا مجموعہ شائع ہوا۔۱۹۰۸ء میں ان کا دوسرا مجموعہ شائع ہوا۔

امجدؔ کی شادی ۱۷۔۱۸ سال کی عمر میں ان کی والدہ نے کروا دی جس سے ان کے یہاں ایک بچی کی پیدائش ہوئی لیکن سوئے قسمت کی ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی میں ایسی طغیانی آئی جس میں ان کی بیوی، بچی اور والدہ تینوں غرقاب ہو گئے۔صرف تنہا امجدؔ زندہ بچے۔

امجدؔ نے ۱۹۱۵ میں عقد ثانی کیا لیکن اس بیوی سے بھی ان کو کوئی اولاد نہیں ہوئی اور یہ خاتون بھی محض ۳۳ سال کی عمر میں انتقال کر گئیں جس سے امجدؔ کو بہت صدمہ پہنچا دوستوں ان کی چارہ سازی کرتے ہوئے انھیں تیسری شادی کا مشورہ دیا امجدؔ نے شادی کی مگر اس بیوی سے ان کا نباہ نہ ہو سکا اور پہلے ہی دن طلاق ہو گئی۔آخر کار امجدؔ نے چوتھی شادی کی اور ان کی یہ بیوی تا زندگی ان کے ساتھ رہیں۔

ملازمت

امجدؔ کو ان کی پہلی ملازمت ان کے ایک قدرداں مولوی عزیز مرزا کے ذریعہ حاصل ہوئی انھوں نے امجد کو مدرسہ دارالعلوم میں بیس روپے ماہوار پر ملازم رکھوا دیا۔ دو سال بعد وہ وہاں سے ترقی پا کر محاسبی کے دفتر میں منتقل ہوگئے وہ وہاں بیس سال تک ملازمت کرتے ہوئے مددگار صدر محاسبی ہو گئے ۔۱۹۳۲ء میں ۴۰۰ روپے ماہوار کے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ اس دوران ان کی شہرت پورے برصغیر میں پھیل چکی تھی تمام اہل ان کے فن کے قدرداں تھے۔ انھوں ایک بھرپور علمی زندگی گزاری اور رباعی گوئی میں ایک اختصاصی مقام حاصل کیا۔

انتقال

امجدؔ حیدرآبادی کا انتقال مارچ ۱۹۶۱ء میں ہوا۔ ان کی نماز جنازہ دوسرے دن مکہ مسجد حیدرآباد میں حضرت عبداللہ شاہ محدث نے پڑھائی اور درگاہ شاہ خاموش میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

13.3.2 امجد حیدرآبادی کی رباعی گوئی

امجدؔ حیدرآبادی نے اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز پندرہ برس کی عمر میں غزل گوئی سے کیا لیکن جلد ہی وہ رباعی گوئی کی طرف مائل ہوگئے ۔ وہ اردو کے ساتھ فارسی میں بھی رباعی کہا کرتے تھے۔ فارسی میں امجدؔ نے امیرالشعرا ترک علی ترکی فردوسی سے اصلاح لی۔ ان کو اردو فارسی کے علاوہ عربی زبان پر بھی کامل دسترس حاصل تھی ۔ان کی رباعیات فنی اور موضوعی دونوں اعتبار سے کاملیت کے درجہ پر متمکن نظر آتی ہیں۔ ان کی کوئی بھی رباعی بحر ہزج سے خارج نہیں ملے اور رباعی کا چوتھا مصرع دل میں اتر جانے کی تاثیر رکھتا ہے۔ امجد کی رباعیات کا پہلا مجموعہ ۱۹۰۵ء میں اور دوسرا ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا جس کو بعد میں رباعیات امجد حصہ اول دوم اور سوم کے نام سے شائع کیا گیا یہ علی الترتیب ۱۹۲۵ء، ۱۹۳۵ء اور ۱۹۵۵ء میں منظر عام پر آئے۔ علاوہ ازیں ان کے دیگر شعری اور نثری تصانیف میں بھی رباعیات ملتی ہیں۔ ان تمام کو کلیات امجدؔ میں جمع کر دیا گیا ہے۔

امجدؔ حیدرآبادی ایک صوفی تھے اور ان کے فن پر بھی متصوفانہ موضوعات کا غلبہ ہے۔ ابتدائی دور میں ان کی شاعری پر داغؔ دہلوی کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے مگر وہ جلدی ہی اس سحر سے نکل آئے۔ انھوں نے غزلیں، نظمیں، قصیدے، قطعات بڑی تعداد میں کہے ہیں لیکن ان کی وجہ شہرت رباعیات ہی کے باعث ہے۔ ان کی رباعیات میں مذہبیات، اخلاقیات، اور صوفیانہ موضوع ہی ملتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی کا پہلو غالب ہے۔ ان کی رباعیات اظہار و معنویت سے معمور ہیں۔ امجدؔ کی زندگی مسلسل حادثات اور آزمائش سے بھری نظر آتی ہے۔ اس غم نے ان کے مزاج میں سنجیدگی، متانت، ہمدردی، چارہ سازی جیسی صفات عالیہ پیدا کر دی تھی۔ نیز تصوف کی آمیزش نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ ان کی رباعیات میں جو درد و غم اور انسان دوستی نمایاں طور دکھائی دیتی ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے۔ ان کی سادگی میں ایسی پرکاری ہے کہ بات دل سے نکلتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے اور ہر ایک کو وہ اپنی ہی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

امجدؔ نے اپنی رباعیات میں مذہبی اصناف کو بخوبی برتا ہے۔ ان کے یہاں مذہب سے متعلق تمام موضوعات ملتے ہیں۔انھوں نے قرآن پاک،احادیث کریمہ اور اقوال سلف کو موضوع بناتے ہوئے بہت سی رباعیات کہی ہیں:

حمد

خالق ہے کوئی ارض وسما شاہد ہے — اَنْتَ کے لئے اپنا اَنَا شاہد ہے
اس پر اگر کوئی نہ مانے نہ سہی — خود اپنے وجود پر خدا شاہد ہے

نعت

طیبہ ہی کو اب کعبۂ مقصد کہیے — دہلیز نبی کو سنگ اسود کہیے
گر حمد خدا کا حق ادا کرنا ہے — دل سے ایک بار یا محمد کہیے

آیت کریمہ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾

یا جلوۂ ذات ہے شعاع خورشید — یا نقش صفات ہے شعاع خورشید
ہر حال میں ہے شان معیّت ثابت — خورشید کے ساتھ ہے شعاع خورشید

حدیث شریف ﴿اِتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ﴾

تا عرش پہنچتی ہے فغاں کی آواز — کس درجہ قوی ہے ناتواں کی آواز
ہے زحمت دردِ عشق رحمت کا سبب — آتی ہے شکستِ دل سے جاں کی آواز

بے ثباتی عالم

دنیا والوں ثبات دنیا میں نہیں — اک لحظہ قرار موج دریا میں نہیں
عالم کا وجود صورت لا سمجھو — لفظ موجود اور معنیٰ میں نہیں

فضلیت نماز

پیراہن کبر چاک ہو جاتا ہے — نفس سرکش ہلاک ہو جاتا ہے
مسلم کے لئے عجیب نعمت ہے نماز — سر خاک میں رکھ کے پاک ہو جاتا ہے

دعا کے بے اثر ہونے کی وجہ

لے لے کے خدا کا نام چلّاتے ہیں — پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز — کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

تصوف امجدؔ کی شاعری کا اصل محور ہے ان کا کل فن اسی دائرے کے ارد گرد گردش کرتا ہے۔ ان کے یہاں حال وقال، جذب ومستی، ترک دنیا، وحدت الوجود، خدمت انسانی جیسے متصوفانہ مضامین کی بہتات ہے۔

یہاں وحدت الوجود سے متعلق ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

وحدت الوجود

واجب سے ظہور کی شکل انسانی ہے　　وحدت میں دوئی کا وہم نادانی ہے
دھوکہ ہے نظر کا ورنہ عالم اوست　　گرداب حباب موج سب پانی ہے

توبہ

نادانی سے پہلے تو خطا کرتے ہیں　　ہٹ کر کے پھر اور بھی برا کرتے ہیں
جب تم سے کوئی گناہ ہو تو توبہ کر لو　　میلے کپڑے کو دھو لیا کرتے ہیں

مذکورہ بالا رباعیات کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ امجد کی رباعی مذہبی اور متصوفانہ ہی ہیں۔ ان کی رباعیات فنی اور موضوعی دنوں سطح پر کاملیت کے درجہ پر فائز ہیں۔

13.3.3 امجد حیدر آبادی کی رباعیات کا تجزیہ

(۱)　ہم صحبت بے خرد، پریشان رہا　　نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی　　نادان کو الٹا بھی تو نادان رہا

اس رباعی میں نااہل کی تربیت سے منع کیا ہے۔اس لئے کہ نااہل شخص کبھی بھی تربیت و نصیحت کو قبول نہیں کرتا۔یعنی جو شخص احمق کی صحبت اختیار کرے گا وہ پریشان رہے گا اور جو ناسمجھ کو سمجھانے کی کوشش کرے گا وہ خود شرمندہ ہوگا اس لئے کہ بے عقل اور ناسمجھ کو سمجھانا وقت کا ضیاع ہے۔جو شخص فطری طور پر جہالت کا مظاہرہ کرتا ہو اس کو علم سکھانے سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔وہ پڑھ لکھ کر بھی جاہلوں والی ہی حرکت کرتا رہتا ہے۔اس بات کی دلیل یہ ہے کہ لفظ نادان کو اگر الٹ کر بھی لکھا جائے تو بھی وہ نادان ہی رہتا ہے۔

(۲)　کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے　　مانند حباب ابھر کر اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس　　تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

اس رباعی میں کم ظرف لوگوں کی قبیح عادات کی نشاندہی کی گئی ہے۔کہ کم ظرف شخص کے پاس اگر کبھی دولت و ثروت آتی ہے تو وہ اس سے دوسروں کو راحت و آرام نہیں پہنچاتا بلکہ وہ بلبلے کے مانند پھول کر ہر آدمی کے سامنے اپنی بڑائی بیان کرتا ہے اور دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔اسی طرح جو آدمی گھٹیا اور کمینہ ہوتا ہے وہ ذرا ذرا سی بات پر فخر کرتا ہے۔اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی معمولی تنکا ہلکی ہوا کے جھونکے سے اڑ جاتا ہے۔

13.3.4 خلاصہ

امجد حیدر آبادی اصل نام ابوالاعظم سید امجد حسین تھا۔ان کے والد گرامی صوفی سید رحیم علی بن سید کریم

الدین ایک متبع شریعت اور متقی شخص تھے۔امجد ۱۸۸۶ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے ابھی وہ چالیس دن کے ہوئے تھے کہ ان کے والد اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔امجد کی پرورش و پرداخت ان کی والدہ گرامی نے کی۔جو ایک نیک طینت اور مذہبی خاتون تھیں۔انھوں نے امجد کی تربیت کا بھرپور خیال رکھا۔

امجد کی ابتدائی تعلیم جامعہ نظامیہ میں ہوئی اسی دوران انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل،مولوی فاضل امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کرلی تھی۔۱۵ سال کی عمر میں انھوں نے عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ فن خطاطی اور علم العروض میں کامل دستگاہ حاصل کرلی تھی اور شعر گوئی کی طرف مائل ہوگئے تھے۔۱۹۰۵ء میں محض انیس سال کی عمر میں ان کا پہلا رباعیات کا مجموعہ شائع ہوا۔۱۹۰۸ء میں ان کا دوسرا مجموعہ شائع ہوا۔

امجدؔ کی شادی ۱۷۔۱۸ سال کی عمر میں ان کی والدہ نے کروادی جس سے ان کے یہاں ایک بچی کی پیدائش ہوئی لیکن سوئے قسمت کی ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی میں ایسی طغیانی آئی جس میں ان کی بیوی، بچی اور والدہ تینوں غرقاب ہوگئے۔صرف تنہا امجدؔ زندہ بچے۔

امجدؔ کو ان کی پہلی ملازمت ان کے ایک قدرداں مولوی عزیز مرزا کے ذریعہ حاصل ہوئی انھوں نے امجد کو مدرسہ دارالعلوم میں بیس روپے ماہوار پر ملازم رکھوادیا۔دوسال بعد وہ وہاں سے ترقی پاکر محاسبی کے دفتر میں منتقل ہوگئے وہ وہاں بیس سال تک ملازمت کرتے ہوئے مددگار صدر محاسبی ہوگئے۔۱۹۳۲ء میں ۴۰۰ روپے ماہوار کے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔اس دوران ان کی شہرت پورے برصغیر میں پھیل چکی تھی تمام اہل ان کے فن کے قدرداں تھے۔انھوں ایک بھرپور علمی زندگی گزاری اور رباعی گوئی میں ایک اختصاصی مقام حاصل کیا۔

امجدؔ حیدرآبادی کا انتقال مارچ ۱۹۶۱ء میں ہوا۔ان کی نماز جنازہ دوسرے دن مکہ مسجد حیدرآباد میں حضرت عبداللہ شاہ محدث نے پڑھائی اور درگاہ شاہ خاموش میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

امجدؔ حیدرآبادی نے اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز پندرہ برس کی عمر میں غزل گوئی سے کیا لیکن جلد ہی وہ رباعی گوئی کی طرف مائل ہوگئے۔وہ اردو کے ساتھ فارسی میں بھی رباعی کہا کرتے تھے۔فارسی میں امجدؔ نے امیر الشعرا ترک علی ترکی فردوسی سے اصلاح لی۔ان کو اردو فارسی کے علاوہ عربی زبان پر بھی کامل دسترس حاصل تھی۔ ان کی رباعیات فنی اور موضوعی دونوں اعتبار سے کاملیت کے درجہ پر متمکن نظر آتی ہیں۔ان کی کوئی بھی رباعی بحر ہزج سے خارج نہیں ملے اور رباعی کا چوتھا مصرع دل میں اتر جانے کی تاثیر رکھتا ہے۔امجد کی رباعیات کا پہلا مجموعہ ۱۹۰۵ء میں اور دوسرا ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا جس کو بعد میں رباعیات امجد حصہ اول دوم اور سوم کے نام سے شائع کیا گیا یہ علی الترتیب ۱۹۲۵ء، ۱۹۳۵ء اور ۱۹۵۵ء میں منظر عام پر آئے۔علاوہ ازیں ان کے دیگر شعری اور نثری تصانیف میں بھی رباعیات ملتی ہیں۔ان تمام کو کلیات امجدؔ میں جمع کردیا گیا ہے۔

13.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ نے

امجد حیدر آبادی کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کی۔

امجد حیدر آبادی کی رباعی گوئی سے آگہی حاصل کی۔

امجد حیدر آبادی کی رباعیات کے موضوعات سے واقفیت حاصل کی۔

امجد حیدر آبادی کی رباعیات کا تجزیہ کیا۔

13.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1. امجد حیدر آبادی کے سوانحی کوائف مختصراً بیان کیجئے؟
2. امجد حیدر آبادی کی رباعیات کے موضوعات پر روشنی ڈالیں؟
3. امجد حیدر آبادی کی کسی ایک رباعی کا تجزیہ پیش کریں؟
4. امجد حیدر آبادی کی رباعی گوئی کے امتیازات کو مختصراً بیان کریں؟

13.6 سوالات کے جوابات

1. امجد حیدر آبادی اصل نام ابوالاعظم سید امجد حسین تھا۔ان کے والد گرامی صوفی سید رحیم علی بن سید کریم الدین ایک متبع شریعت اور متقی شخص تھے۔امجد ۱۸۸۶ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے ابھی وہ چالیس دن کے ہوئے تھے کہ ان کے والد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔امجد کی پرورش و پرداخت ان کی والدہ گرامی نے کی۔جو ایک نیک طینت اور مذہبی خاتون تھیں۔انھوں نے امجد کی تربیت کا بھرپور خیال رکھا۔

امجد کی ابتدائی تعلیم جامعہ نظامیہ میں ہوئی اسی دوران انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل، مولوی فاضل امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کر لی تھی۔۱۵ سال کی عمر میں انھوں نے عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ فن خطاطی اور علم العروض میں کامل دستگاہ حاصل کر لی تھی اور شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں محض انیس سال کی عمر میں ان کا پہلا رباعیات کا مجموعہ شائع ہوا۔۱۹۰۸ء میں ان کا دوسرا مجموعہ شائع ہوا۔

امجدؔ کی شادی ۱۷۔۱۸ سال کی عمر میں ان کی والدہ نے کروا دی جس سے ان کے یہاں ایک بچی کی پیدائش ہوئی لیکن سوئے قسمت کی ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی میں ایسی طغیانی آئی جس میں ان کی بیوی، بچی اور والدہ تینوں غرقاب ہو گئے۔صرف تنہا امجدؔ زندہ بچے۔

امجدؔ کو ان کی پہلی ملازمت ان کے ایک قدرداں مولوی عزیز مرزا کے ذریعہ حاصل ہوئی انھوں نے امجد کو مدرسہ دار العلوم میں بیس روپے ماہوار پر ملازم رکھوا دیا۔دو سال بعد وہ وہاں سے ترقیپا کر محاسبی کے دفتر میں منتقل ہو گئے وہ وہاں بیس سال تک ملازمت کرتے ہوئے مددگار صدر محاسبی ہو گئے۔۱۹۳۲ء میں ۴۰۰ روپے ماہوار کے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔اس دوران ان کی شہرت پورے برصغیر میں پھیل چکی تھی تمام اہل ان کے فن

کے قدرداں تھے۔انھوں ایک بھرپور علمی زندگی گزاری اور رباعی گوئی میں ایک اختصاصی مقام حاصل کیا۔

2. امجؔد حیدرآبادی ایک صوفی تھے اور ان کے فن پر بھی متصوفانہ موضوعات کا غلبہ ہے۔ابتدائی دور میں ان کی شاعری پر داغؔ دہلوی کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے مگر وہ جلدی ہی اس سحر سے نکل آئے۔انھوں نے غزلیں، نظمیں، قصیدے،قطعات بڑی تعداد میں کہے ہیں لیکن ان کی وجہ شہرت رباعیات ہی کے باعث ہے۔ان رباعیات میں مذہبیات،اخلاقیات،اور صوفیانہ موضوع ہی ملتے ہیں۔ان کے یہاں عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی کا پہلو غالب ہے۔ان کی رباعیات اظہار و معنویت سے معمور ہیں۔امجؔد کی زندگی مسلسل حادثات اور آزمائش سے بھری نظر آتی ہے۔اس غم نے ان کے مزاج میں سنجیدگی،متانت، ہمدردی، چارہ سازی جیسی صفات عالیہ پیدا کردی تھی۔نیز تصوف کی آمیزش نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ان کی رباعیات میں جو درد و غم اور انسان دوستی نمایاں طور دکھائی دیتی ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے۔ان کی سادگی میں ایسی پرکاری ہے کہ بات دل سے نکلتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے اور ہر ایک کو وہ اپنی ہی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

3. ہم صحبت بےخرد، پریشان رہا نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی نادان کو الٹا بھی تو نادان رہا

اس رباعی میں نااہل کی تربیت سے منع کیا ہے۔اس لئے کہ نااہل شخص کبھی بھی تربیت و نصیحت کو قبول نہیں کرتا۔یعنی جو شخص احمق کی صحبت اختیار کرے گا وہ پریشان رہے گا اور جو ناسمجھ کو سمجھانے کی کوشش کرے گا وہ خود شرمندہ ہوگا اس لئے کہ بےعقل اور ناسمجھ کو سمجھانا وقت کا ضیاع ہے۔جو شخص فطری طور پر جہالت کا مظاہرہ کرتا ہو اس کو علم سکھانے سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔وہ پڑھ لکھ کر بھی جاہلوں والی ہی حرکت کرتا رہتا ہے۔اس بات کی دلیل یہ ہے کہ لفظ نادان کو اگر الٹ کر بھی لکھا جائے تو بھی وہ نادان ہی رہتا ہے۔

4. ان کی رباعیات میں مذہبیات،اخلاقیات،اور صوفیانہ موضوع ہی ملتے ہیں۔ان کے یہاں عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی کا پہلو غالب ہے۔ان کی رباعیات اظہار و معنویت سے معمور ہیں۔امجؔد کی زندگی مسلسل حادثات اور آزمائش سے بھری نظر آتی ہے۔اس غم نے ان کے مزاج میں سنجیدگی،متانت، ہمدردی، چارہ سازی جیسی صفات عالیہ پیدا کردی تھی۔نیز تصوف کی آمیزش نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ان کی رباعیات میں جو درد و غم اور انسان دوستی نمایاں طور دکھائی دیتی ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے۔ان کی سادگی میں ایسی پرکاری ہے کہ بات دل سے نکلتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے اور ہر ایک کو وہ اپنی ہی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

امجؔد نے اپنی رباعیات میں مذہبی اصناف کو بخوبی برتا ہے۔ان کے یہاں مذہب سے متعلق تمام موضوعات ملتے ہیں۔انھوں نے قرآن پاک،احادیث کریمہ اور اقوال سلف کو موضوع بناتے ہوئے بہت سی رباعیات کہی ہیں۔تصوف امجؔد کی شاعری کا اصل محور ہے ان کا کل فن اسی دائرے کے اردگرد گردش کرتا ہے۔ان

کے یہاں حال و قال، جذب و مستی، ترک دنیا، وحدت الوجود، خدمت انسانی جیسے متصوفانہ مضامین کی بہتات ہے۔

13.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
متبع	اتباع کرنے والا، پیر کرنے والا
خطاطی	خوش نویسی، طریقۂ کتابت،
حال	صوفیہ کی اصطلاح میں: ایک قسم کی بے خودی
جذب	کشش، کھنچاؤ
متانت	سنجیدہ، مہذب
سنگ اسود	کالا پتھر، خانۂ کعبہ میں نصب ایک کالے رنگ کا پتھر جو جنت سے آیا ہے۔
معیّت	ساتھ ہونا، ہمراہی ہونا
شعاع	روشنی، کرن، چمک
فغاں	نالہ، آہ زاری، فریاد، شور غل
بے ثباتی	ناپائے داری، کمزوری، مٹنے والی
پیراہن	لباس، کپڑا
کبر	بڑائی، غرور
نفس	جان، روح
وحدت	ایک ہونا، توحید، یکتائی
دوئی	دو ہونا، شرکت، جوڑا ہونے کی حالت،
ضیاع	نقصان، ضائع ہونا، برباد ہونا
خسیس	بخیل، کنجوس، معمولی، حقیر
طینت	عادت، طبیعت، نیک

13.8 کتب برائے مطالعہ

1. رباعیات امجد	سید احمد حسین امجدؔ
2. یادگار امجد	محمد اکبر الدین صدیقی

3. کلیات امجد پروفیسر عطااللہ خاں
4. رباعیات امجد حیدرآبادی کا موضوعی تناظر ڈاکٹر قطب سرشار
5. ارمغان امجد خواجہ حمیدالدین شاہد

اکائی14. فراق گورکھپوری: حیات اور رباعی گوئی

ساخت

14.1اغراض ومقاصد

14.2 تمہید

14.3فراق گورکھپوری: حیات اور رباعی گوئی

14.3.1فراق گورکھپوری: سوانحی کوائف

14.3.2فراق گورکھپوری کی رباعی گوئی

14.3.3فراق گورکھپوری کی رباعیات کا تجزیہ

14.3.4خلاصہ

14.4 آپ نے کیا سیکھا؟

14.5اپنا امتحان خود لیجئے

14.6سوالات کے جوابات

14.7 کلیدی الفاظ

14.8 کتب برائے مطالعہ

14.1اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کرنے کے بعد آپ

فراقؔ گورکھپوری کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کریں گے۔

فراقؔ گورکھپوری کی رباعی نگاری سے متعارف ہوں گے۔

فراقؔ گورکھپوری کی رباعیات کا تجزیہ کرکے اسے سمجھیں گے۔

14.2 تمہید

طلبائے گرامی! آپ گزشتہ اکائی میں امجد حیدر آبادی کے سوانحی کوائف اور ان کی رباعی گوئی سے آگاہ ہوئے اب اس اکائی میں آپ فراقؔ گورکھپوری کے سوانحی کوائف سے آشنا ہوں گے اور ان کی رباعی گوئی سے بحث کریں گے۔ان کی رباعیات کے امتیازات کو سمجھیں گے۔

14.3 فراق گورکھپوری: حیات اور رباعی گوئی

14.3.1 فراق گورکھپوری: سوانحی کوائف

فراقؔ گورکھپوری کا اصل نام رگھو پتی سہائے تھا۔ فراقؔ ان کا تخلص تھا۔ وہ ۲۸/ اگست ۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ فراقؔ کے والد گورکھ پرشاد بھی شاعر تھے اور عبرتؔ تخلص کرتے تھے۔ فراقؔ نے اردو و فارسی کی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ اس کے بعد میٹرک کا امتحان گورنمنٹ جوبلی کالج گورکھپور سے پاس کیا۔ ۱۸ برس کی عمر میں گھر والوں نے ان کی شادی کر دی لیکن یہ شادی ان کے لئے ساری زندگی سوہان روح بنی رہی۔ فراقؔ بچپن سے شعر و شاعری کے دلدادہ تھے چنانچہ نوجوانی کی ابتدا میں انھوں نے شاعری شروع کر دی۔ انھوں نے اپنی پہلی باقاعدہ غزل ۲۰ سال کی عمر میں کہی اس وقت وہ بی۔ اے میں تھے۔ جس سال فراقؔ نے بی۔ اے کا پڑھائی مکمل کی اسی سال ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ فراقؔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ ان کے سر پر خاندانی ذمہ داریاں آ پڑیں لیکن ابھی وہ ان ذمیداریوں کو اٹھانے کے قابل نہ ہو سکے تھے چنانچہ وہ نفسیاتی طور پر ٹوٹ گئے اس حالت میں وہ مزید تعلیمی سلسلہ آگے نہ بڑھا سکے۔

فراقؔ ابھی اسی شش و پنج میں تھے انھوں نے حب الوطنی اور ملکی آزادی کے جوش میں سیاست میں قدم رکھ دیا۔ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے انھیں ۱۸/ ماہ قید بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں لیکن خوش قسمتی سے جیل میں انھیں کئی ادیبوں اور شاعروں سے صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا جن نے ان کے شعری ذوق کو جلا بخشنے میں ایندھن کا کام کیا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد ان کو کانگریس کا انڈر سیکریٹری بنایا گیا۔ لیکن آزادی کے بعد وہ اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ ایم۔ اے کیا۔ اسی زمانے میں وہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں لیکچرار مقرر ہو گئے اور ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے۔ فراقؔ کی معاشی اور علمی حالت بہتر ہونے کے باوجود وہ ساری زندگی طرح طرح کی گھریلو پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ پہلے ان کا بھائی انھیں چھوڑ کر چلا گیا پھر بیٹے نے خودکشی کر لی اور آخر میں ان کی بیوی بھی ان کو چھوڑ کر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی۔ ان نجی مسائل نے فراقؔ کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر بہت نقصان پہنچایا اور ان کے پاس شراب و شاعری سے دل بہلانے کے علاوہ کچھ نہیں بچا تھا۔ گھر کے باہر وہ میر مجلس ہوتے جہاں اپنی شاعری، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سے لوگوں کو محظوظ کرتے رہتے تھے مگر ان کے اپنے گھر میں ان کے لیے تنہائی سے نجات پانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس کا سارا الزام ان کے اقربا کے سر نہیں مندھا جا سکتا بلکہ گھر والوں کے ساتھ فراقؔ کے خودسر اور اکھڑ رویے نے سب کو ان کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

علمی و ادبی دنیا نے فراقؔ کی خوب قدر کی اور ان کو مختلف اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں ان کو ساہتیہ اکیڈمی ایواڈ دیا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں سووت نہرو ایواڈ ملا اور پھر حکومت ہند نے ان کو پدم بھوشن سے سرفراز

کیا۔۱۹۷۰ء وہ ساہتیہ اکیڈمی کے فیلو بنائے گئے اور ان کے مجموعہ 'گل نغمہ' پر ان کو گیان پیٹھ ایوارڈ عطا کیا گیا ۱۹۸۱ء میں ان کو غالب ایوارڈ دیا گیا۔

انتقال

فراق گورکھپوری کا انتقال ۳؍مارچ ۱۹۸۲ء میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہوا اور ان کی آخری رسومات الہ آباد میں ادا کی گئیں۔

14.3.2 فراق گورکھپوری کی رباعی گوئی

فراقؔ گورکھپوری اردو کے معروف شاعر اور نقاد تھے۔انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اور زبان و ادب کو مایہ دار بنانے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فلسفہ شاعری سے بھی آشنا کیا۔فراقؔ کی شاعری تنہائی اور ہجر کی شاعری ہے جسے انھوں نے اپنے سکوت نیم شبی میں دریافت کیا ہے۔ان میں سے جو واقعات و احساسات اہم رہے ہیں اسے انھوں نے شعری پیکر عطا کر دیا ہے۔اس کے باوجود ان کی شاعری کو محض ذاتی و شخصی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں روح عصر کی بھی ترجمانی پائی جاتی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں زندگی کے مسائل اور اس کی تلخیوں کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

فراقؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کے کلام کا وافر حصہ اسی صنف کی مشاطگی میں گزرا ہے۔ انھوں نے ایک زمانے میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم گوئی میں بھی طبع آزمائی کی مگر ان کی نظمیں فنی اعتبار سے دوسرے درجہ کی حیثیت کی حامل ہیں جن میں محض مصنوعی بلند آہنگی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

فراقؔ نظم گوئی میں تو کوئی خصوصی کارنامہ انجام نہ دے سکے لیکن ایک دوسری شعری صنف یعنی رباعی کو نئی جہت سے آشنا کرنے میں وہ پوری طرح سے کامیاب رہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اردو شاعری کی اس کمی کو تلاش کر لیا تھا جس کی طرف عام طور پر دوسرے شعرا نے توجہ نہیں کی تھی۔وہ خلا تھا اردو زبان میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور ہندو اساطیر و دیومالا کی ترجمانی۔چنانچہ فراقؔ نے روپ کی رباعیات کے ذریعے اس خلا کو پُر کرنے کا جو اہتمام کیا وہ اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے لیکن ان کی رباعیات اتنی زیادہ معیاری نہیں ہیں کہ ان کو فارسی یا اردو کی اعلیٰ ترین رباعیات کی صف میں رکھا جا سکے۔اردو کے معروف نقاد پروفیسر ممتاز حسین ان کی رباعیات کے محاسن و معائب کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی ہر رباعی دوسری رباعی کی بازگشت معلوم ہوتی ہے، پھر یہ کہ ان کی رباعیات میں سراپا کی تصویر کشی کے علاوہ کوئی کہانی ،کوئی پلاٹ،کوئی ڈراما،کوئی رمزیت نہیں۔اور یہ رباعی نگاری کے آداب کے منافی ہے۔جوشؔ کی رباعیات میں جو کیفیت مختصر کہانیوں کی ہے وہ فراقؔ کی رباعیات کی تشبیہات میں نہیں ہے۔چند رباعیوں میں انھوں نے چھوٹے چھوٹے ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو عورت کی گھریلو زندگی سے تعلق رکھتے

ہیں لیکن ان رباعیات میں بھی کوئی کہانی پن یا ایسا کوئی ارتکاز فکر پیدا نہیں کر پائے ہیں جو فارسی اور اردو کی اعلیٰ رباعیات میں ملتا ہے۔تاہم اس کے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ اردو شاعری میں سنگھار رس کی مختصر نظموں کی جو کمی تھی ۔اس کو انھوں نے اپنی رباعیوں سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔''

فراقؔ کے مجموعۂ رباعیات 'روپ' دراصل سنگھار رس کو ہی پیش کیا گیا ہے جیسا کہ روپ کے سرورق پر اس کی وضاحت موجود ہے۔ یہاں سنگھار رس کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن میں الگ الگ عضو اور سراپا وغیرہ کی تصویر کشی کی گئی ہے:

محبوب کے سراپا کی الفاظ میں تصویر کشی دیکھیں

ابر ہلتے ہیں یا لچکتی ہے کٹار — یہ روپ کی رحمتوں کی جیسے چمکار
یہ لوچ، یہ دھج، یہ مسکراہٹ یہ نگاہ — یہ موج نفس کہ سانس لیتی ہے بہار

محبوب کے قد کا نقشہ دیکھیں

قامت ہے کہ انگڑائیاں لیتی سرگم — ہو رقص میں جیسے رنگ و بو کا عالم
جگمگ جگمگ ہے شبنمستان ارم — یا قوس قزح لچک رہی ہے پیہم

محبوب کے ہونٹوں کا خاکہ

یہ چہرا کھلا ہوا یہ مہکے ہوئے ہونٹ — یہ گیسوؤں کی لپٹ یہ لہکے ہوئے ہونٹ
یہ تازہ دمی، یہ مسکراہٹ، یہ نشاط — سانسوں کی ٹھنڈی لَو سے دہکے، ہوئے ہونٹ

ان کی رباعیات کی دوسری بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ کا ایسی چابکدستی سے استعمال کیا گیا ہے کہ وہ بالکل اردو کے ساتھ پیوست ہو گئے ہیں۔فراقؔ نے روپ کے مقدمہ میں خود اس بات کی وضاحت کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''ان رباعیوں میں میں نے اس کی کوشش کی ہے کہ موقعے موقعے سے نہایت احتیاط سے سنسکرت الفاظ لائے جائیں اور اردو کی فصاحت میں بالکل فرق نہ آنے پائے۔'' (روپ،ص۱۳)

کھلتی کلی، مسکراتے ہونٹھوں کی مہک — منڈلاتی ہوئی گھٹائیں الکوں کی لٹک
جوبن کی مدھ۔کلس بھی چھلکے چھلکے — ماتھے کے چندر۔لوک کی نرم دمک

یہ روپ مدنؔ کے بھی خطا ہوں اوسان — یہ سج جو توڑ دے رتیؔ کا ابھمان
پھیکی پڑتی ہے دھوپ یہ جوبن جوت — یہ رنگ کہ آنکھ کھول دے جیون گان

فراقؔ کی رباعیات کسی گہرے فکر و فن کی حامل نظر نہیں آتی اس لئے ان میں موضوعات یا فن کی سطح پر

یکسانیت کا گمان ہوتا ہے اگر وہ سنگھار رس کے علاوہ دیگر رسوں کو برئے کار لاتے تو ان کی رباعیات کا مقام اور بھی بلند ہو بالا ہو جاتا لیکن یہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ انھوں نے اردو رباعی کو نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ان کی اس خدمت کو رباعی کی سطح پر ہر زمانے میں سراہا گیا ہے اور سراہا جاتا رہے گا۔

14.3.3 فراق گورکھپوری کی رباعیات کا تجزیہ

(۱) ہر ساز سے ہوتی نہیں یہ دھن پیدا ہوتا ہے بڑے جتن سے یہ گن پیدا
میزان نشاط وغم میں صدیوں تل کر ہوتا ہے حیات میں توازن پیدا

اس رباعی میں فراقؔ نے زندگی میں توازن وتناسب پیدا ہونے کا مرحلہ بیان کیا ہے۔انھوں نے پہلے اور دوسرے مصرعے میں یہ واضح کیا ہے جس طرح ہر ساز سے توازن کی دھن نہیں پیدا ہوتی بلکہ اسے تخلیق کرنے کے لئے لاکھوں جتن کرنے پڑتے ہیں۔یعنی کسی موسیقی کار کو کسی ساز سے اگر ایک خاص دھن ایجاد کرنی ہو تو اسے کوئی عرصے تک ریاض کرنا پڑتا ہے جب وہ ساز سے اپنا من چاہا نغمہ تخلیق کر سکتا ہے۔اسی طرح زندگی میں توازن اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان خوشی اور غم دونوں مرحلوں میں کھل کر جینا سیکھ جاتا ہے تو اس کی زندگی میں توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

(۲) غنچے کو نسیم گدگدائے جیسے مطرب کوئی ساز چھیڑ جائے جیسے
یوں پھوٹ رہی ہے مسکراہٹ کی کرن مندر میں چراغ جھلملائے جیسے

اس رباعی میں فراقؔ نے سنگھار رس کے تحت محبوب کی مسکراہٹ کو تین تشبیہات کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میرے محبوب کی مسکراہٹ اتنی دلکش ہے جیسے بادنسیم کسی کلی کو گدگدا دے تو وہ آہستگی کے ساتھ کھل جاتا۔یا کوئی سازندہ اپنے ساز پر کوئی نغمہ چھیڑتا بالکل اسی طرح میرے محبوب کی مسکراہٹ ہے۔یا اس کی مسکراہٹ کی ادا کا اگر تو دور سے نظارہ کرے تو تجھے ایسا معلوم ہوگا جیسے مندر میں کوئی دیا جھلملا رہا ہے۔

14.3.4 خلاصہ

فراقؔ گورکھپوری کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا۔فراقؔ ان کا تخلص تھا۔وہ ۲۸/اگست ۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔فراقؔ کے والد گورکھ پرشاد بھی شاعر تھے اور عبرتؔ تخلص کرتے تھے۔فراقؔ نے اردو و فارسی کی تعلیم گھر پر ہی پائی۔اس کے بعد میٹرک کا امتحان گورنمنٹ جوبلی کالج گورکھپور سے پاس کیا۔۱۸ برس کی عمر میں گھر والوں نے ان کی شادی کر دی لیکن یہ شادی ان کے لئے ساری زندگی سوہان روح بنی رہی۔فراقؔ بچپن سے شعر و شاعری کے دلدادہ تھے چنانچہ نوجوانی کی ابتدا میں انھوں نے شاعری شروع کر دی۔انھوں نے اپنی پہلی باقاعدہ غزل ۲۰ سال کی عمر میں کہی اس وقت وہ بی۔اے میں تھے۔جس سال فراقؔ نے بی۔اے کا پڑھائی مکمل کی اسی

سال ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔فراقؔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ ان کے سر پر خاندانی ذمہ داریاں آپڑیں لیکن ابھی وہ ان ذمیداریوں کو اٹھانے کے قابل نہ ہوسکے تھے چنانچہ وہ نفسیاتی طور پر ٹوٹ گئے اس حالت میں انھوں وہ مزید تعلیمی سلسلہ آگے نہ بڑھا سکے۔۱۹۳۰ء میں انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ ایم۔اے کیا۔اسی زمانے میں وہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں لیکچرار مقرر ہوگئے اور ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے۔فراقؔ گورکھپوری کا انتقال ۳؍مارچ ۱۹۸۲ء میں حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ہوا اور ان کی آخری رسومات الہ آباد میں ادا کی گئیں۔

فراقؔ اردو رباعی کو نئی جہت سے آشنا کرنے میں پوری طرح سے کامیاب رہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اردو شاعری کی اس کمی کو تلاش کرلیا تھا جس کی طرف عام طور پر دوسرے شعرا نے توجہ نہیں کی تھی۔وہ خلا تھا اردو زبان میں ہندوستانی تہذیب وثقافت اور ہندو اساطیر و دیومالا کی ترجمانی۔چنانچہ فراقؔ نے روپ کی رباعیات کے ذریعے اس خلا کو پر کرنے کا جو اہتمام کیا وہ اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ضرور ہیں لیکن وہ اتنی بھی معیاری نہیں ہیں کہ ان کو فارسی یا اردو کی اعلیٰ ترین رباعیات کی صف میں رکھا جاسکے۔اردو کے معروف نقاد پروفیسر ممتاز حسین نے ان کی رباعیات کے محاسن ومعائب کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کی ہر رباعی دوسری رباعی کی بازگشت معلوم ہوتی ہے، پھر یہ کہ ان کی رباعیات میں سراپا کی تصویر کشی کے علاوہ کوئی کہانی ،کوئی پلاٹ،کوئی ڈراما،کوئی رمزیت نہیں۔اور یہ رباعی نگاری کے آداب کے منافی ہے۔جوشؔ کی رباعیات میں جو کیفیت مختصر کہانیوں کی ہے وہ فراقؔ کی رباعیات کی تشبیہات میں نہیں ہے۔چند رباعیوں میں انھوں نے چھوٹے چھوٹے ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو عورت کی گھریلو زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان رباعیات میں بھی کوئی کہانی پن یا ایسا کوئی ارتکاز فکر پیدا نہیں کر پائے ہیں جو فارسی اور اردو کی اعلیٰ رباعیات میں ملتا ہے۔تاہم اس کے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ اردو شاعری میں سنگھار رس کی مختصر نظموں کی جو کمی تھی ۔اس کو انھوں نے اپنی رباعیوں سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔''

فراقؔ کے مجموعۂ رباعیات 'روپ' دراصل سنگھار رس کو ہی پیش کیا گیا ہے جیسا کہ روپ کے سرورق پر اس کی وضاحت موجود ہے۔اس لئے ان کی رباعیات میں کوئی خاص فکر یا گہرا فلسفہ نہیں ملتا جو ان کی رباعیات کو بلند مقام تک پہنچا سکے۔جو محبوب کے سراپے سے ابتدا کرتے اور اسی پر ان کی انتہا بھی ہوجاتی ہے۔گویا سنگھار رس ہی ان کی رباعیات کا کل سرمایہ ہے۔

14.4 آپ نے کیا سیکھا؟

فراقؔ گورکھپوری کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل کی۔

فراقؔ گورکھپوری کی رباعی گوئی سے آگہی حاصل کی۔

فراقؔ گورکھپوری کی رباعیات کے موضوعات سے واقفیت حاصل کی۔

فراقؔ گورکھپوری کی رباعیات کا تجزیہ کیا۔

14.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1. فراقؔ گورکھپوری کے سوانحی کوائف مختصراً بیان کیجئے؟
2. فراقؔ گورکھپوری کی رباعیات کے موضوعات پر روشنی ڈالیں؟
3. فراقؔ گورکھپوری کی کسی ایک رباعی کا تجزیہ پیش کریں؟
4. فراقؔ گورکھپوری کی رباعی گوئی کے امتیازات کو مختصراً بیان کریں؟

14.6 سوالات کے جوابات

1. فراقؔ گورکھپوری کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا۔فراقؔ ان کا تخلص تھا۔وہ ۲۸/اگست ۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔فراقؔ کے والد گورکھ پرشاد بھی شاعر تھے اور عبرتؔ تخلص کرتے تھے۔فراقؔ نے اردو و فارسی کی تعلیم گھر پر ہی پائی۔اس کے بعد میٹرک کا امتحان گورنمنٹ جوبلی کالج گورکھپور سے پاس کیا۔۱۸ برس کی عمر میں گھر والوں نے ان کی شادی کر دی لیکن یہ شادی ان کے لئے ساری زندگی سوہان روح بنی رہی۔فراقؔ بچپن سے شعروشاعری کے دلدادہ تھے چنانچہ نوجوانی کی ابتدا میں انھوں نے شاعری شروع کر دی۔انھوں نے اپنی پہلی باقاعدہ غزل ۲۰ سال کی عمر میں کہی اس وقت وہ بی۔اے میں تھے۔جس سال فراقؔ نے بی۔اے کا پڑھائی مکمل کی اسی سال ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔فراقؔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ ان کے سر پر خاندانی ذمہ داریاں آپڑیں لیکن ابھی وہ ان ذمیداریوں کو اٹھانے کے قابل نہ ہوسکے تھے چنانچہ وہ نفسیاتی طور پر ٹوٹ گئے اس حالت میں انھوں وہ مزید تعلیمی سلسلہ آگے نہ بڑھا سکے۔۱۹۳۰ء میں انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ ایم۔اے کیا۔اسی زمانے میں وہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں لیکچرار مقرر ہوگئے اور ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے۔فراقؔ گورکھپوری کا انتقال ۳/مارچ ۱۹۸۲ء میں حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ہوا اور ان کی آخری رسومات الہ آباد میں ادا کی گئیں۔

2. فراقؔ اردو رباعی کو نئی جہت سے آشنا کرنے میں پوری طرح سے کامیاب رہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اردو شاعری کی اس کمی کو تلاش کر لیا تھا جس کی طرف عام طور پر دوسرے شعرا نے توجہ نہیں کی تھی۔وہ خلا تھا اردو زبان میں ہندوستانی تہذیب وثقافت اور ہندو اساطیر و دیومالا کی ترجمانی۔چنانچہ فراقؔ نے روپ کی رباعیات کے ذریعے اس خلا کو پر کرنے کا جو اہتمام کیا وہ اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ضرور ہے۔

فراقؔ کے مجموعۂ رباعیات 'روپ' دراصل سنگھار رس کو ہی پیش کیا گیا ہے جیسا کہ روپ کے سرورق پر اس کی وضاحت موجود ہے۔اس لئے ان کی رباعیات میں کوئی خاص فکر یا گہرا فلسفہ نہیں ملتا جو ان کی رباعیات کو

بلند مقام تک پہنچا سکے۔ جو محبوب کے سراپے سے ابتدا کرتے اور اسی پر ان کی انتہا بھی ہو جاتی ہے۔ گویا سنگھار رس ہی ان کی رباعیات کا کل سرمایہ ہے۔

3. غنچے کو نسیم گدگدائے جیسے مطرب کوئی ساز چھیڑ جائے جیسے
یوں پھوٹ رہی ہے مسکراہٹ کی کرن مندر میں چراغ جھلملائے جیسے

اس رباعی میں فراقؔ نے سنگھار رس کے تحت محبوب کی مسکراہٹ کو تین تشبیہات کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے محبوب کی مسکراہٹ اتنی دلکش ہے جیسے بادِ نسیم کسی کلی کو گدگدا دے تو وہ آہستگی کے ساتھ کھل جاتا۔ یا کوئی سازندہ اپنے ساز پر کوئی نغمہ چھیڑتا بالکل اسی طرح میرے محبوب کی مسکراہٹ ہے۔ یا اس کی مسکراہٹ کی ادا کا اگر تو دور سے نظارہ کرے تو تجھے ایسا معلوم ہوگا جیسے مندر میں کوئی دیا جھلملا رہا ہے۔

4. فراقؔ اردو رباعی کو نئی جہت سے آشنا کرنے میں پوری طرح سے کامیاب رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اردو شاعری کی اس کمی کو تلاش کر لیا تھا جس کی طرف عام طور پر دوسرے شعرا نے توجہ نہیں کی تھی۔ وہ خلا تھا اردو زبان میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور ہندو اساطیر و دیومالا کی ترجمانی۔ چنانچہ فراقؔ نے روپ کی رباعیات کے ذریعے اس خلا کو پر کرنے کا جو اہتمام کیا وہ اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ضرور ہیں لیکن وہ اتنی بھی معیاری نہیں ہیں کہ ان کو فارسی یا اردو کی اعلیٰ ترین رباعیات کی صف میں رکھا جا سکے۔ اردو کے معروف نقاد پروفیسر ممتاز حسین نے ان کی رباعیات کے محاسن و معائب کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کی ہر رباعی دوسری رباعی کی بازگشت معلوم ہوتی ہے، پھر یہ کہ ان کی رباعیات میں سراپا کی تصویر کشی کے علاوہ کوئی کہانی، کوئی پلاٹ، کوئی ڈراما، کوئی رمزیت نہیں۔ اور یہ رباعی نگاری کے آداب کے منافی ہے۔ جوشؔ کی رباعیات میں جو کیفیت مختصر کہانیوں کی ہے وہ فراقؔ کی رباعیات کی تشبیہات میں نہیں ہے۔ چند رباعیوں میں انھوں نے چھوٹے چھوٹے ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو عورت کی گھریلو زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان رباعیات میں بھی کوئی کہانی پن یا ایسا کوئی ارتکازِ فکر پیدا نہیں کر پائے ہیں جو فارسی اور اردو کی اعلیٰ رباعیات میں ملتا ہے۔ تاہم اس کے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ اردو شاعری میں سنگھار رس کی مختصر نظموں کی جو کمی تھی۔ اس کو انھوں نے اپنی رباعیوں سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔''

فراقؔ کے مجموعۂ رباعیات 'روپ' دراصل سنگھار رس کو ہی پیش کیا گیا ہے جیسا کہ روپ کے سرورق پر اس کی وضاحت موجود ہے۔ اس لئے ان کی رباعیات میں کوئی خاص فکر یا گہرا فلسفہ نہیں ملتا جو ان کی رباعیات کو

14.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
صعوبت	تکلیف، پریشانی
حب الوطنی	ملک سے محبت
میر مجلس	صدرِ مجلس، اہم آدمی
وافر	زیادہ
مشاطگی	بال سنوارنا، کسی چیز کو اچھے انداز میں کرنا
بازگشت	آواز کا بار بار لوٹنا، گونج
رمز	راز، پوشیدہ چیز
ارتکاز	توجہ
ارم	جنت
قوس وقزح	سات رنگ جو بارش سے پہلے آسمان میں ظاہر ہوتے ہیں

14.8 کتب برائے مطالعہ

1. روپ	فراق گورکھپوری
2. مطالعہ رباعیات فراق گورکھپوری	سید تقی عابدی
3. فراق گورکھپوری	گوپی چند نارنگ
4. فراق شخص اور شاعر	شمیم حنفی
5. کلیات فراق	چودھری ابن النصیر

اکائی15.اہم رباعی گوشعرا کی رباعی گوئی کا اجمالی جائزہ

ساخت

15.1اغراض ومقاصد

15.2 تمہید

15.3اہم رباعی گوشعرا کی رباعی گوئی کا اجمالی جائزہ

15.4خلاصہ

15.5 آپ نے کیا سیکھا؟

15.6اپنا امتحان خود لیجئے

15.7سوالات کے جوابات

15.8 کلیدی الفاظ

15.9 کتب برائے مطالعہ

اکائی15.اہم رباعی گوشعرا کی رباعی گوئی کا اجمالی جائزہ

15.1اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کرنے کے بعد آپ

اردو کے کچھ اہم رباعی گوشعرا سے واقفیت حاصل کریں گے۔

اہم رباعی گویوں میں شامل شعرا کے کلام سے مستفید ہوں گے۔

15.2 تمہید

عزیز طلبائے کرام !اس اکائی میں ہم اردو زبان کے اہم رباعی گویوں سے واقفیت حاصل کریں گے۔ جن میں علی الترتیب یہ شعرا شامل ہیں ۔محمد قلی قطب شاہ،ولی دکنی،سودا،قائم،درد،میر،حسرت،مومن،جوش ملسیانی،محروم،رواں،جوش ملیح آبادی۔

15.3اہم رباعی گوشعرا کی رباعی گوئی کا اجمالی جائزہ

اردو زبان نے اپنی ابتدا سے ہی شاعری پر خصوصی توجہ صرف کی ہے ۔اس سلسلہ میں اس کی شعری اصناف میں سب سے زیادہ غزل گوئی پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسری اصناف پر بھی مشق سخن

کے قابل قدر نمونے ہمیں شروعاتی دور سے ہی ملنے لگے ہیں۔ان میں سے ایک صنف رباعی بھی ہے۔رباعی کا صنف اردو میں فارسی سے آئی ہے اور فارسی میں اس زمانے تک ایک سے بڑھ کر ایک رباعی گو گزر چکے تھے جنھوں نے رباعی گوئی کے فن کو بام عروج پہنچا دیا تھا۔اس سے متاثر ہو کر اردو میں بھی شروعات سے اس صنف پر توجہ کی گئی لیکن رباعیات کے نقش اول اردو میں کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے اس مرتبے پر نہیں پہنچتے جہاں پر فارسی کی رباعیات پہنچ چکی تھیں اگر چہ مرورزمانہ کے ساتھ دیگر اصناف کی طرح رباعی نے بھی ترقی کی اور اس نے بھی عالمی رباعی گوئی میں اپنا ایک مقام بنایا۔ چنانچہ اس اکائی میں ہم بہت ہی اختصار کے ساتھ اردو کے اہم ترین رباعی گویوں کے کلام سے واقفیت حاصل کریں گے جنھوں نے اردو رباعی کو اس اعلیٰ مقام تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ ہیں ۔ یہ قطب شاہی ریاست کے پانچویں بادشاہ تھے۔انھوں نے دکنی اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کی ہے۔فارسی میں قطب شاہ اور دکنی میں معانیؔ تخلص کرتے تھے۔محمد قلی قطب شاہ کے دیوان کافی ضخیم ہے۔اس میں کل اشعار کی تعداد پچاس ہزار ہے اور انھوں نے اس زمانے کی تمام معروف اصناف میں طبع آزمائی ہے۔ان کے کلام میں موضوعات کے لحاظ سے کافی تنوع پایا جاتا ہے جو ان کی دروں بینی کا غماز ہے اور کے شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ان کے کلام میں عشق و عاشقی کے موضوعات کی کثرت پائی جاتی ہے ساتھ ہی عارفانہ نکات،شاہی محل کی رعنائیاں اور درباری شان وشوکت کے علاوہ مختلف تہواروں اور سماج کے الگ الگ طبقات کی پریشانیوں کا بیان بھی ملتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں ۳۹؍رباعیات بھی ملتی ہیں جن میں حمد،نعت،منقبت،تصوف،اخلاق اور عشق و عاشقی کے موضوعات ملتے ہیں۔ان کی رباعیات کا اسلوب نہایت سادہ اور سلیس ہے۔

قدیم دکنی اردو ہونے کے باعث آج اس کو پوری طرح سمجھنا تھوڑا مشکل ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی سلاست و روانی،سادگی وشیرینی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اس بنا پر آج بھی ان کی رباعیات ادب میں قابل قدر سمجھی جاتی ہیں:

تج مکھ انگے عاقبت افسانہ رہیا   تج نین انکے عقل سو دیوانہ رہیا
تج فتنے تھے روزگار کنج میں بیٹھا   ہور سور ترے چھانوں تھے تج خانہ رہیا

دکن میں دوسرے اہم ترین رباعی گو ولی دکنی ہیں۔ان کی پیدائش ۱۶۶۸ء میں اورنگ آباد میں ہوئی۔ اردو شاعری میں ولی کی حیثیت ایک اہم شاعر کے طور پر ہمیشہ باقی رہے گی ان کے ذریعہ سے شمالی ہند میں ریختہ کی شاعری جو فروغ حاصل ہوا وہ ان کا تاریخی کارنامہ ہے اور اسے ادب میں کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ولیؔ کا ہی فیض ہے کہ اہل دہلی جس زبان کی شاعری کو دوں مرتبہ خیال کرتے تھے ولی کے دیوان اور خود ان کے دہلی آنے

کے بعد شعرا کا ایک بڑا طبقہ اردو زبان کی شاعری کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ فائزؔ، آبروؔ، ناجیؔ، حاتمؔ، یکرنگؔ، مرزا مظہرؔ جانجاناں، مضمونؔ اور تاباںؔ جیسے شعرا منصۂ شہود پر آئے۔

ولی کے دیوان میں مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ہر صنف میں انھوں نے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ غزل گوئی کے باب میں ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ ساتھ ہی ان کے دیوان میں ۲۶ رباعیات بھی ملتی ہیں جن میں متنوع موضوعات کو برتا گیا ہے۔ ان میں تصوف، فلسفہ، مذہب اور عشق و عاشقی کے خصوصی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ولی کی زبان اگر چہ قدیم دکنی اردو ہے لیکن اس میں سادگی سلاست و روانی کا ایک سمندر موجزن نظر آتا ہے جو اپنی کشش اور جاذبیت میں بے مثل ہے:

رکھ دھیان کوں ہر آن تو معبود طرف　　رکھ سیس کوں ہر حال میں مسجود طرف
معدوم کوں موجود سوں کیا نسبت ہے　　اولیٰ ہے کہ مائل ہوتوں موجود طرف

مرزا محمد رفیع سوداؔ اردو زبان کے بڑے قصیدہ نگار شاعر ہیں انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور تمام اصناف کو بخوبی برتا ہے لیکن ان کی وجہ شہرت قصدے کے باب میں اہم ترین ہے۔ ان کی غزل گوئی بھی اردو میں اہمیت کی حامل ہے۔ سوداؔ نے غزل اور قصیدے کے علاوہ مرثیہ، مثنوی، ہجو، مستزاد، قطعات، واسوخت، تاریخ، پہیلی اور رباعی کے صنف پر بھی دادِ سخن دی ہے۔ کلیات سوداؔ میں ۸۰ رباعیات ملتی ہیں۔ ان میں تصوف و معرفت مذہب و اخلاق، مدح و ہجو، عشق و عاشقی اور تعلّی وغیرہ کے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کی رباعیات زبان و بیان کے لحاظ سے نہایت پختہ اور جاذبیت و کشش کے لحاظ سے بہت عمدہ ہیں۔

کوتاہ نہ عمر مے پرستی کیجیے　　زلفوں سے تری دراز دستی کیجیے
ساقی نہ ہو جو شراب ہے آج وہ ابر　　پانی پی پی کے آج فاقہ مستی کیجیے

قائمؔ چاندپوری (۱۷۵۲ء۔۱۷۹۴ء) کا اصل نام شیخ قیام الدین قائم تھا۔ یہ چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں سکونت رکھتے تھے، خواجہ میر درد اور مرزا سوداؔ سے کلام پر اصلاح لی۔ دہلی کی تباہی کے بعد ٹانڈہ کے نواب یار محمد خان کے یہاں ملازم ہوئے اور تیس سال وہاں رہنے کے بعد رام پور آئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ قائم میرؔ، دردؔ اور سوداؔ کے ہم عصر اس کے باوجود ان کے کلام منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اگر چہ ان کے یہاں دردؔ اور سوداؔ کا تتبع ملتا ہے مگر انھوں جلدی ہی اپنی انفرادی شناخت قائم کر لی تھی۔ انھوں نے اس زمانہ میں مروجہ تمام اصناف سخن میں اپنی قادرالکلامی کا ثبوت بہم پہنچایا اور اساتذۂ فن سے دادِ سخن وصول کی ہے۔ ان کا کلام جامع، ہمہ گیر اور عام فہم ہے ان میں کمال درجے کی سلاست و روانی پائی جاتی ہے نیز انھوں نے اصلاح زبان کا کام بھی بخوبی انجام دیا ہے۔

قائم کے کلیات میں ۱۰۱ رباعیات درج ہیں جو گونا گوں موضوعات کا مرقع معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں

تصوف، اخلاق، عشق، اور ذاتی نوعیت کی رباعیات بھی پائی جاتی ہیں۔ان کو انھوں نے بڑی فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ان کی رباعیات زبان و بیان اور رفعت خیال کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

قائمؔ کی جو شوکت گدائی دیکھی　　درویشی کے روپ میں خدائی دیکھی
پروانہ تھی گر کریں دو عالم سجدا　　سنتے تھے غرض سو کبریائی دیکھی

خواجہ میر دردؔ اردو میں صوفیانہ شاعری کے رہنما تسلیم کئے جاتے ہیں۔وہ ذاتی اور خاندانی دونوں اعتبار سے صوفی تھے اور ان کا کلام اس کا بین ثبوت بھی ہے۔اردو میں میر دردؔ کی اصل وجہ شہرت ان کی غزل گوئی کی وجہ سے ہے مگر دیگر اصناف سخن میں بھی انھوں نے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

دردؔ کے کلام میں رباعیات کا تناسب کم ہے لیکن اس کے باوجود ان کی رباعیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تصوف کے موضوع پر دردؔ کی طرح رباعیات کم ہی شعرا کے یہاں ملتی ہیں۔ کیونکہ دردؔ کا تصوف صرف قولی نہیں ہے بلکہ وہ عملی بھی ہے انھوں نے بہت سی چیزیں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہیں ہیں جس میں کمال درجہ کی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ جو سوز ساز ملتا ہے وہ کسی اور کے یہاں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔دردؔ نے اپنی رباعیات میں تصوف کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو بہت سلیس اور جاذب انداز میں پیش کیا ہے۔زبان و بیان کی شیرینی و شفافیت نے اس کی کشش دو چند کر دی ہے۔اس لئے رباعی کے باب میں درد کی رباعیات کی اہمیت ہر زمانے میں قائم رہے گی۔

آرام نہ دن کو بیقراری کے سبب　　نے رات کو چین آہ زاری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھو　　یہ کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

خدائے سخن میر تقی میرؔ نے اردو شاعری کی مختلف اصناف میں اپنی عظمت و بلندی کا لوہا منوایا ہے۔تمام اساتذۂ فن ان کے سامنے سرنگوں نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری زبان و بیان کے سلسلے میں استنادی حیثیت کی حامل ہونے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایسا سوز رکھتی جس کی نظیر اردو شاعری میں نہیں ملتی۔میرؔ نے اپنی شاعرانہ مہارت سے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا ہے۔

میر نے خصوصی طور پر غزل اور مثنوی کے فن کو جلا بخشا ہے اس کے ساتھ ہی ان کے کلیات میں سوا سو کے قریب رباعیات بھی پائی جاتی ہیں۔جن ان کی غزلوں کی طرح سوز و گداز، حلاوت شیرینی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔انداز بیان میں سادگی کے ساتھ پرکاری ہوتی جو پوری طرح قاری کی توجہ اپنی جانب منعطف کر لیتی ہے۔ یہ اتنی پہلودار ہوتی ہے کہ اپنی سادگی کے باوجود اس میں معانی کی تہیں پوشیدہ ہوتی ہیں جو سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتی اور وہ اس میں گم ہو جاتا ہے۔میر کی رباعیات اپنے سوز اور زبان و بیان کے اعتبار سے ہر دور میں مرکزی حیثیت کی حامل رہیں گی جن سے کسی طور پر بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

ہم میرؔ سے کہتے ہیں نہ تو رویا کر ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ دُرِّ نایاب کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

میرزا جعفر علی حسرتؔ دہلی کے باشندے تھے۔انھوں قیام دہلی ہی کے زمانے میں شاعری شروع کردی تھی مگر انھیں مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔پھر وہ لکھنؤ منتقل ہوئے اور یہاں انھوں شاعری میں خاصا نام کمایا۔جرأت لکھنوی ان کے ہی شاگرد ہیں۔حسرت نے اردو شاعری کی تمام مروجہ اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ان کے کلیات میں غزل،مثنوی،قصیدہ،ساقی نامہ،واسوخت،مسدس،مخمس،ترجیع بند،ترکیب بند اور رباعیات کثرت سے ملتی ہیں لیکن ان کے کلام میں اپنے ہم عصر شعرا کی طرح تخیل کی وہ بلندی نظر نہیں آتی اس کے باوجود ان کے یہاں دہلوی طرز شاعری کا رچا بسا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔

حسرت کے دیوان میں ۵۰۰ رباعیات پائی جاتی ہیں جو مختلف موضوعات جیسے توحید،نعت،منقبت، اخلاق، مذہب اور عشق و عاشقی پر مشتمل ہیں۔ان میں اندونی سوز وساز کی کمی پائی جاتی ہے لیکن بیان کی صفائی اور سادگی نے اسے قابل قدر نمونے کی حیثیت عطا کردی ہے۔

موندھ آنکھ کو اپنی بصر آجائے گی سب کر گوش کو بنداب خبر آجائے گی سب
حسرتؔ تو گریباں میں ٹک سر کو ڈال اللہ کی قدرت نظر آجائے گی سب

مومن خاں مومنؔ دہلوی (۱۸۰۰ء۔۱۸۵۳ء) اردو شاعری میں اپنی غزل گوئی کے لحاظ سے اہم مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے مروجہ علوم عقلیہ ونقلیہ شاہ عبدالعزیز،شاہ عبدالقادر سے حاصل کئے اور اپنے والد غلام نبی خاں اور اپنے چچا غلام حیدر خاں خان سے فن طبابت سیکھا۔علاوہ ازیں علم نجوم،علم رمل اور موسیقی میں بھی مہارت حاصل کی۔مومن ایک فطری شاعر تھے انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی لیکن یہ سلسلہ جلدی ہی منقطع ہو گیا اور وہ خود ہی مشق سخن کرنے لگے۔

مومن اردو غزل گوئی میں ایک انفرادی حیثیت کے حامل ہیں لیکن انھوں نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف کی بھی توجہ کی ہے جن میں قصیدہ،مثنوی،مخمس،ترجیع بند،ترکیب بند وغیرہ شامل ہیں۔مومن کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ان کی نازک خیالی،بلند پروازی اور معنی آفرینی ہے۔وہ زبان و بیان پر پوری گرفت رکھتے ہیں ان کی یہاں تشبیہات واستعارات کا استعمال بخوبی ہوا ہے اور حسن وعشق کی کیفیات کو بیان کرنے میں انھیں مشاقی حاصل ہے۔لیکن ان کے موضوعات نہایت محدود ہیں جس سے ان کا فن وہ کمال حاصل نہ کرسکا جس کے وہ لائق تھے۔

غزل کے علاوہ مومن نے بڑی تعدا میں رباعیات بھی کہی ہیں جن کی تعداد ۱۵۰ کے قریب ہے۔لیکن ان کی غزلوں کے مقابلے میں ان کی رباعیات کمزور نظر آتی ہیں۔اگرچہ زبان و بیان کے لحاظ سے وہ بہت چست

اور رواں ہیں۔انھوں نے اپنی رباعیات میں مذہب،تصوف،مناجات،توبہ،محبت اور عشق وعاشقی کے موضوعات کو بخوبی پیش کیا ہے۔مضامین کے تنوع اور اسلوب کی دلکشی نے ان کی رباعیات کو بلند مقام عطا کر دیا ہے جسے کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

افسوس شکایت نہانی نہ گئی　　دل پر سے رقیب کی گرانی نہ گئی
الطاف تھے بس کہ روبرئے دشمن　　اس شوق سے بدگمانی نہ گئی

پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی (۱۸۸۴ء۔۱۹۷۶ء) صوبۂ پنجاب کے ملسیان نامی گاؤں میں ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں حاصل کی پھر قریب ہی کے ایک مڈل اسکول میں داخلہ لیا جہاں اپنی پڑھائی مکمل کی۔اسی دوران والد کی وفات ہو جانے کی وجہ سے وہ مڈل سے آگے کی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے کے علاوہ ان پر تلاش معاش کی ذمیداری بھی آ گئی۔لاہور سے انھوں نے ٹیچرس ٹرینگ کی اس کے بعد جالندھر چھاونی کے ایک اسکول میں مدرس ہو گئے پھر بہتر ملازمت کی تلاش میں پنجاب میں مختلف جگہوں پر منتقل ہوتے رہے آخر کانکو در ضلع جالندھر میں سکونت اختیار کر لی اور یہیں انھوں نے اپنی پوری زندگی گزار دی۔

جوش ملسیانی نے غزل کے علاوہ رباعی کی صنف پر خصوصی توجہ کی ہے۔ان کی رباعیات کا مجموعہ 'نغمۂ سروش' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔اس میں ۱۸۴/رباعیات درج ہیں جو حسب ترتیب عناوین کے تحت کہی گئی ہیں مثلاً خدا سے خطاب،حسن وعشق،فیشن،پیری وجوانی،بہار،زندہ دلی،اخلاقیات،،دنیا،چاند،مفلسی،چکبست،ٹیگور کی مدح میں،رندانہ،قومی،اور متفرق۔موضوعات کے اس تنوع سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ رباعی کے فن میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ان کی رباعیات خیال کی جدت،احساس کی شدت،مشاہدے کی وسعت اور فنی پختگی کا بین ثبوت ہیں۔

اب ناچنے گانے میں برائی نہ رہی　　عریانیٔ تن پہ جگ ہنسائی نہ رہی
آورگیِ طبع سے نفرت تو کجا　　ظاہر کی بھی انگشت نمائی نہ رہی

تلوک چند محرومؔ (۱۸۸۵ء۔۱۹۶۶ء) پنجاب کے باشندے تھے۔وہ اردو و فارسی زبان پر مکمل مہارت رکھتے تھے۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے درس وتدریس سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔آزادی کے بعد ہجرت کر کے دہلی میں قیام پذیر ہوئے اور تیج نامی اخبار سے منسلک ہو رہے پھر پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج میں اردو و فارسی کے لکچرار ہو گئے اور تعلیم وتعلم میں اپنی پوری زندگی گزار دی۔

محرومؔ ایک طبعی شاعر تھے۔انھوں نے دس سال کی عمر سے شعر گوئی کی ابتدا کر دی تھی۔ان کا شعری سرمایہ غزل،نظم،قطعہ،مرثیہ،نوحہ اور رباعی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ان کی رباعیات کا مجموعہ رباعیات محروم کے نام سے شائع ہوا جس میں ۵۷۰/رباعیات موجود ہیں۔یہ کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے رباعی کے فن میں اہم

ترین اضافہ ہے۔محرومؔ کی رباعیات اکثر و بیشتر توحید، مناجات، پیری، منظر نگاری، سماج، تصوف و عرفان، مذہب و اخلاق، پند و نصائح اور یادرفتگاں کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ان کی رباعیات میں زبان و بیان اور تخیل کی بلندی پائی جاتی ہے جو رباعی کے باب میں اہم ترین اضافہ ہے۔

انکار گناہ بھی کئے جاتا ہوں　　تکرار گناہ بھی کئے جاتا ہوں
حاصل ہو ثواب مفت اس لالچ میں　　اقرار گناہ بھی کئے جاتا ہوں

چودہری جگت موہن لال رواںؔ ۱۹۸۹ء میں اناؤ یوپی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اناؤ میں ہی مولوی سبحان اللہ سے حاصل کی لیکن نو سال کی عمر میں وہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے چنانچہ ان بڑے بھائی چودھری کنھیا لال مزید تعلیم کے لئے ان کو موراواں لے آئے جہاں انھوں نے ۱۹۰۷ء میں ہائی اسکول میں امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔آگے کی تعلیم کے لئے وہ لکھنؤ چلے آئے اور یہاں انھوں نے کیننگ کالج سے انٹر کیا۔۱۹۱۱ء میں بی۔اے مکمل کیا اور اسی کننگ کالج سے انگریزی میں ایم۔اے بھی کیا پھر انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔بی کا امتحان پاس کیا اور اناؤ میں وکالت کرنے لگے اور جلدی اس پیشے میں انھوں نے بہت شہرت حاصل کر لی۔

رواںؔ جتنے کامیاب وکیل تھے اس سے کہیں بڑھ کر وہ شاعر تھے۔انھوں ۱۹۰۶ء میں ہی عزیز لکھنوی سے کلام پر اصلاح لینی شروع کر دی تھی۔انھوں نے نظم و نثر دونوں ہی میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔شاعری میں انھوں صنف رباعی کی طرف خصوصی توجہ کی ہے جس پر ان کی ۲۳۲ رباعیات شاہد ہیں۔ان کے مجموعہ کلام 'روح رواں' اور 'باقیات رواں' میں یہ رباعیات ملتی ہیں۔رواں کا شمار اردو کے اہم ترین رباعی گویوں میں ہوتا ہے۔ان کی رباعیات فکری و فنی لحاظ سے بہت بلند و بالا ہیں۔جن میں ان کی ندرت فکر، ذہانت و فطانت اور اسلوب کی روانی کا بین ثبوت ملتا ہے۔ان کی رباعیات میں موضوعات کا رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔اس میں حکمت، فلسفہ، اخلاق، وعظ، تصوف و عرفان، رندی و شرشاری، سیاست، وطن پرستی، دنیا کی بے ثباتی، موت و حیات اور انسانیت جیسے موضوعات کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے جس میں عقل و جذبے کا بہترین امتزاج ملتا ہے جو ان کی رباعی کو اردو میں ایک انفرادی شان عطا کرتا ہے اور ان کو اردو کے اہم ترین رباعی گویوں کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔

رہرو بھی راہبر بھی ہوتے جانا　　دمساز بھی نوحہ گر بھی ہوتے جانا
آتی ہے یہ مرقد غریباں سے صدا　　جانے والے ادھر سے بھی ہوتے جانا

شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی (۱۸۹۸ء۔۱۹۸۲ء) اردو ادب میں شاعر شباب اور شاعر انقلاب کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔شعر گوئی کا فن ان کو وراثت میں ملا جسے انھوں نے بام عروج تک پہنچا دیا۔جوشؔ کا

تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا ان کا بچپن بہت عیش وآرام میں گزرا لیکن اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔اس علمی کمی کو انھوں نے اپنے مطالعے کے شوق سے پورا کیا اور زبان و بیان پر انھوں نے استادانہ مہارت حاصل کر لی۔اصلاح سخن کے لئے عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ابتدائی زمانے میں انھوں نے مختلف جگہوں پر تھوڑے تھوڑے عرصے کام کیا پھر آخر کار ان کو دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد میں ملازمت مل گئی۔کچھ مدت وہاں رہے پھر دہلی آ گئے اور یہاں سے رسالہ 'کلیم' جاری کیا۔آل انڈیا ریڈیو سے بھی منسلک رہے اور سرکاری رسالہ 'آج کل' کی ادارت کا کام بھی سرانجام دیا۔تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور وہاں لغت سازی اور دیگر ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔۱۹۸۲ء میں ان کا انتقال اسلام آباد پاکستان میں ہوا۔

جوشؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن جلدی وہ اس کی ریزہ خیالی سے نظم گوئی کی طرف متوجہ ہو گئے اور نظم گوئی میں اپنے بلند آہنگی اور جوشیلے انداز سے پورے مطلع پر چھا گئے۔جوشؔ نے صنف رباعی پر بھی خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ان کے کلام میں ۶۰۰ سے زائد رباعیات موجود ہیں۔ان کے عاشقانہ مزاج کی جھلک ان کی رباعیات میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ان کی رباعیات میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے جن میں خمریات، عشق، سیاست، سماج، فلسفہ، خودی و بے خودی، جبر و اختیار، پیری و موت، عقل و جذبہ، خوشی و غم جیسے موضوعات ملتے ہیں۔وہ صداقت و انسانیت کے علمبردار ہیں اور پوری قوت و صلابت سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔زبان و بیان کے زور، تخیل کی بلند پروازی، ڈرامائیت اور قصہ پن نے ان کی رباعیات کو وہ مقام عطا کیا ہے جہاں تک چند ایک رباعی گو ہی پہنچ سکے ہیں۔ان کی رباعیات کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

رقصاں ہو جو باطن میں جوانی ہے وہی　　پیدا ہو جو خود سے، کامرانی ہے وہی
چشمے کی طرح دل سے جو تیرے پھوٹے　　اے یار عزیز! شادمانی ہے وہی

اس اکائی میں بہت اختصار کے ساتھ صرف چند اہم رباعی گویوں کا اجمالی جائزہ پیش کر دیا گیا ہے۔اس میں تقدیم و تاخیر اور درجہ بندی سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف یہ دکھانے کی کوشش کی گئی اردو زبان میں رباعیات کی صنف ایک زندہ و جاوید صنف ہے اور ہر زمانے میں شعرا نے اس میں اپنا بہترین سرمایہ چھوڑا ہے اور عصر حاضر میں بھی بہت سے شعرا اس صنف پر توجہ کر رہے ہیں جس سے یہ روز بروز مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔اردو زبان میں رباعیات کا اتنا بڑا سرمایہ پایا جاتا ہے جو کسی بھی طرح دنیا کی معروف ترین زبانوں کے مقابلے میں کمتر نہیں ہے بلکہ آج یہ دنیا کی بڑی سی بڑی زبان کے مقابل رکھی جا سکتی ہے۔

15.4 خلاصہ

اردو زبان نے اپنی ابتدا سے ہی شاعری پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔اس سلسلہ میں اس کی شعری

اصناف میں سب سے زیادہ غزل گوئی پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسری اصناف پر بھی مشق سخن کے قابل قدر نمونے ہمیں شروعاتی دور سے ہی ملنے لگے ہیں۔ان میں سے ایک صنف رباعی بھی ہے۔رباعی کا صنف اردو میں فارسی سے آئی ہے اور فارسی میں اس زمانے تک ایک سے بڑھ کر ایک رباعی گو گزر چکے تھے جنھوں نے رباعی گوئی کے فن کو بام عروج پہنچا دیا تھا۔اس سے متاثر ہو کر اردو میں بھی شروعات سے اس صنف پر توجہ کی گئی لیکن رباعیات کے نقش اول اردو میں کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے اس مرتبے پر نہیں پہنچتے جہاں پر فارسی کی رباعیات پہنچ چکی تھیں اگر چہ مرور زمانہ کے ساتھ دیگر اصناف کی طرح رباعی نے بھی ترقی کی اور اس نے بھی عالمی رباعی گوئی میں اپنا ایک مقام بنایا۔

اردو کے پہلے رباعی گو محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں ۳۹/رباعیات بھی ملتی ہیں جن میں حمد،نعت، منقبت،تصوف،اخلاق اور عشق و عاشقی کے موضوعات ملتے ہیں۔ان کی رباعیات کا اسلوب نہایت سادہ اور سلیس ہے۔

دکن کے دوسرے اہم رباعی گو ولی دکنی کے دیوان میں ۲۶ رباعیات بھی ملتی ہیں جن میں متنوع موضوعات کو برتا گیا ہے۔ان میں تصوف،فلسفہ،مذہب اور عشق و عاشقی کے خصوصی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ولی کی زبان اگر چہ قدیم دکنی اردو ہے لیکن اس میں سادگی سلاست و روانی کا ایک سمندر موجزن نظر آتا ہے جو اپنی کشش اور جاذبیت میں بے مثل ہے۔

شمالی ہند سے تعلق رکھنے والے میرزا محمد رفیع سودا کے کلیات میں ۸۰/رباعیات ملتی ہیں۔ان میں تصوف ومعرفت مذہب واخلاق،مدح وہجو،عشق و عاشقی اور تعلّی وغیرہ کے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ان کی رباعیات زبان و بیان کے لحاظ سے نہایت پختہ اور جاذبیت و کشش کے لحاظ سے بہت عمدہ ہیں۔

قائم کے کلیات میں ۱۰۱ رباعیات درج ہیں جو گونا گوں موضوعات کا مرقع معلوم ہوتی ہیں۔ان میں تصوف،اخلاق،عشق،اور ذاتی نوعیت کی رباعیات بھی پائی جاتی ہیں۔ان کو انھوں نے بڑی فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ان کی رباعیات زبان و بیان اور رفعت خیال کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

دردؔ کے کلام میں رباعیات کا تناسب کم ہے لیکن اس کے باوجود ان کی رباعیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تصوف کے موضوع پر دردؔ کی طرح رباعیات کم ہی شعرا کے یہاں ملتی ہیں۔ کیونکہ دردؔ کا تصوف صرف قولی نہیں ہے بلکہ وہ عملی بھی ہے انھوں نے بہت سی چیزیں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہیں ہیں جس میں کمال درجہ کی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ جو سوز ساز ملتا ہے وہ کسی اور کے یہاں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔دردؔ نے اپنی رباعیات میں تصوف کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو بہت سلیس اور جاذب انداز میں پیش کیا ہے۔زبان و بیان کی شیرینی وشفافیت نے اس کی کشش دو چند کر دی ہے۔اس لئے رباعی کے باب میں درد کی

رباعیات کی اہمیت ہر زمانے میں قائم رہے گی۔

میر تقی میرؔ کے کلیات میں سوا سو کے قریب رباعیات بھی پائی جاتی ہیں۔جن میں ان کی غزلوں کی طرح سوز و گداز، حلاوت و شیرینی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔انداز بیان میں سادگی کے ساتھ پرکاری ہوتی جو پوری طرح قاری کی توجہ اپنی جانب منعطف کر لیتی ہے۔یہ اتنی پہلودار ہوتی ہے کہ اپنی سادگی کے باوجود اس میں معانی کی تہیں پوشیدہ ہوتی ہیں جو سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور وہ اس میں گم ہو جاتا ہے۔میر کی رباعیات اپنے سوز اور زبان و بیان کے اعتبار سے ہر دور میں مرکزی حیثیت کی حامل رہیں گی جن سے کسی طور پر بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

جعفر علی حسرت کا تعلق دہلی اور لکھنؤ دونوں ادبی مرکزوں سے رہا ہے۔حسرت کے دیوان میں ۵۰۰ رباعیات پائی جاتی ہیں جو مختلف موضوعات جیسے توحید، نعت، منقبت، اخلاق، مذہب اور عشق و عاشقی پر مشتمل ہیں۔ان میں اندونی سوز و ساز کی کمی پائی جاتی ہے لیکن بیان کی صفائی اور سادگی نے اسے قابل قدر نمونے کی حیثیت عطا کر دی ہے۔

اردو کے نامور غزل کو شاعر مومن خاں مومن نے بڑی تعداد میں رباعیات بھی کہی ہیں۔لیکن ان کی غزلوں کے مقابلے میں ان کی رباعیات کمزور نظر آتی ہیں۔اگر چہ زبان و بیان کے لحاظ سے وہ بہت چست اور رواں ہیں۔انھوں نے اپنی رباعیات میں مذہب، تصوف، مناجات، توبہ، محبت اور عشق و عاشقی کے موضوعات کو بخوبی پیش کیا ہے۔مضامین کے تنوع اور اسلوب کی دلکشی نے ان کی رباعیات کو بلند مقام عطا کر دیا ہے جسے کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جوشؔ ملسیانی نے غزل کے علاوہ رباعی کی صنف پر خصوصی توجہ کی ہے۔ان کی رباعیات کا مجموعہ 'نغمۂ سروش' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔اس میں ۱۸۴/ رباعیات درج ہیں جو حسب ترتیب عناوین کے تحت کہی گئی ہیں مثلاً خدا سے خطاب، حسن و عشق، فیشن، پیری و جوانی، بہار، زندہ دلی، اخلاقیات ، دنیا، چاند، مفلسی، چکبست ، ٹیگور کی مدح میں، رندانہ، قومی، اور متفرق۔موضوعات کے اس تنوع سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ رباعی کے فن میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ان کی رباعیات خیال کی جدت، احساس کی شدت، مشاہدے کی وسعت اور فنی پختگی کا بین ثبوت ہیں۔

تلوک چند محرومؔ کی رباعیات کا مجموعہ رباعیات محروم کے نام سے شائع ہوا جس میں ۵۷۰ رباعیات موجود ہیں۔یہ کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے رباعی کے فن میں اہم ترین اضافہ ہے۔محرومؔ کی رباعیات اکثر و بیشتر توحید، مناجات، پیری، منظر نگاری، سماج، تصوف و عرفان، مذہب و اخلاق، پند و نصائح اور یاد رفتگاں کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ان کی رباعیات میں زبان و بیان اور تخیل کی بلندی پائی جاتی ہے جو رباعی کے باب میں

اہم ترین اضافہ ہے۔

جگت موہن لال رواں نے بھی صنف رباعی کی طرف خصوصی توجہ کی ہے جس پر ان کی ۲۳۲ رباعیات شاہد ہیں۔ان کے مجموعہ کلام 'روح رواں' اور 'باقیات رواں' میں یہ رباعیات ملتی ہیں۔رواں کا شمار اردو کے اہم ترین رباعی گویوں میں ہوتا ہے۔ان کی رباعیات فکری وفنی لحاظ سے بہت بلند و بالا ہیں۔جن میں ان کی ندرت فکر ،ذہانت وفطانت اور اسلوب کی روانی کا بین ثبوت ملتا ہے۔ان کی رباعیات میں موضوعات کا رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔اس میں حکمت،فلسفہ،اخلاق،وعظ،تصوف وعرفان،رندی وشرشاری، سیاست ،وطن پرستی ،دنیا کی بے ثباتی،موت وحیات اور انسانیت جیسے موضوعات کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے جس میں عقل و جذبے کا بہترین امتزاج ملتا ہے جو ان کی رباعی کو اردو میں ایک انفرادی شان عطا کرتا ہے اور ان کو اردو کے اہم ترین رباعی گویوں کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔

اسی طرح جوش ملیح آبادی کے کلام میں ۶۰۰ سے زائد رباعیات موجود ہیں۔ان کے عاشقانہ مزاج کی جھلک ان کی رباعیات میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ان کی رباعیات میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے جن میں خمریات،عشق، سیاست ،سماج، فلسفہ،خودی و بے خودی ، جبر واختیار، پیری وموت ،عقل وجذبہ،خوشی وغم جیسے موضوعات ملتے ہیں۔وہ صداقت وانسانیت کے علمبردار ہیں اور پوری قوت وصلابت سے اس کا اظہار کرتے ہیں ۔زبان و بیان کے زور، تخیل کی بلند پروازی، ڈرامائیت اور قصہ پن نے ان کی رباعیات کو وہ مقام عطا کیا ہے جہاں تک چند ایک رباعی گو ہی پہنچ سکے ہیں۔ان کی رباعیات کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

15.5 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی میں آپ نے اردو کے کچھ اہم رباعی گو شعرا سے واقفیت حاصل ہے جو حسب ذیل ہیں:

محمد قلی قطب شاہ، ولؔی دکنی ،سودا، قائؔم ،دردؔ، میرؔ،حسرؔت ،مومؔن، جوشؔ ملسیانی،محرؔوم،رواؔں، جوشؔ ملیح آبادی

15.6 اپنا امتحان خود لیجئے

1. محمد قلی قطب شاہ کی شاعری پر مختصراً نوٹ لکھئے؟
2. درد کی صوفیانہ رباعیات پر اختصار سے روشنی ڈالیں۔
3. مذکورہ بالا شعرا میں سے کسی ایک کی ایک رباعی کا تجزیہ پیش کریں۔
4. جوش ملیح آبادی کی رباعی گوئی کے امتیازات کو مختصراً بیان کریں

15.7 سوالات کے جوابات

1. اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ ہیں۔ یہ قطب شاہی ریاست کے پانچویں بادشاہ تھے۔انھوں نے دکنی اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کی ہے۔ فارسی میں قطب شاہ اور دکنی میں معانؔی تخلص کرتے تھے۔محمد قلی قطب شاہ کے دیوان کا فی ضخیم ہے۔اس میں کل اشعار کی تعداد پچاس ہزار ہے اور انھوں نے اس زمانے کی تمام معروف اصناف میں طبع آزمائی ہے۔ان کے کلام میں موضوعات کے لحاظ سے کافی تنوع پایا جاتا ہے جو ان کی دروں بینی کا غماز ہے اور کے شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ان کے کلام میں عشق و عاشقی کے موضوعات کی کثرت پائی جاتی ہے ساتھ ہی عارفانہ نکات ،شاہی محل کی رعنائیاں اور درباری شان وشوکت کے علاوہ مختلف تہواروں اور سماج کے الگ الگ طبقات کی پریشانیوں کا بیان بھی ملتا ہے۔

2. خواجہ میر دردؔ اردو میں صوفیانہ شاعری کے رہنما تسلیم کئے جاتے ہیں۔وہ ذاتی اور خاندانی دونوں اعتبار سے صوفی تھے اور ان کا کلام اس کا بین ثبوت بھی ہے۔اردو میں میر دردؔ کی اصل وجہ شہرت ان کی غزل گوئی کی وجہ سے ہے مگر دیگر اصناف سخن میں بھی انھوں نے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

دردؔ کے کلام میں رباعیات کا تناسب کم ہے لیکن اس کے باوجود ان کی رباعیات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تصوف کے موضوع پر دردؔ کی طرح رباعیات کم ہی شعرا کے یہاں ملتی ہیں۔ کیونکہ دردؔ کا تصوف صرف قولی نہیں ہے بلکہ وہ عملی بھی ہے انھوں نے بہت سی چیزیں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہیں ہیں جس میں کمال درجہ کی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ جو سوز ساز ملتا ہے وہ کسی اور کے یہاں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔دردؔ نے اپنی رباعیات میں تصوف کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو بہت سلیس اور جاذب انداز میں پیش کیا ہے۔زبان و بیان کی شیرینی وشفافیت نے اس کی کشش دو چند کر دی ہے۔اس لئے رباعی کے باب میں درد کی رباعیات کی اہمیت ہر زمانے میں قائم رہے گی۔

3. اب ناچنے گانے میں برائی نہ رہی عریانیِ تن پہ جگ ہنسائی نہ رہی
آورگیِ طبع سے نفرت تو کجا ظاہر کی بھی انگشت نمائی نہ رہی

مذکوہ بالا رباعی تلوک چند محروم کی ہے۔اس میں انھوں نے جدید تہذیب میں پائی جانے والی خرابیوں پر طنز کیا ہے کہ اس زمانے میں لوگ ناچنے گانے والوں کو برا نہیں سمجھتے جب کہ ایک وقت تھا کہ ناچنے گانے والوں کو معاشرے میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔اسی طرح شریف اور مہذب لوگ اپنے لباس اور وضع وقطع کا پہلے زمانوں میں بہت خیال رکھتے تھے اور وہ بے پردگی اور عریانیت کو باعث شرمندگی سمجھتے تھے۔اسی طرح آوارہ طبیعت لوگوں کو معاشرے میں نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا لیکن اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ لوگ ان تمام برائیوں پر انگشت نمائی بھی نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کو فیشن جان کر اپنانے میں لگے ہوئے ہیں۔

4. جوشؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن جلدی وہ اس کی ریزہ خیالی سے نظم گوئی کی طرف

متوجہ ہو گئے اور نظم گوئی میں اپنے بلند آہنگی اور جوشیلے انداز سے پورے مطلع پر چھا گئے۔ جوشؔ نے صنف رباعی پر بھی خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ ان کے کلام میں ۶۰۰ سے زائد رباعیات موجود ہیں۔ ان کے عاشقانہ مزاج کی جھلک ان کی رباعیات میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان کی رباعیات میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے جن میں خمریات، عشق، سیاست، سماج، فلسفہ، خودی و بے خودی، جبر و اختیار، پیری و موت، عقل و جذبہ، خوشی و غم جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ وہ صداقت و انسانیت کے علمبردار ہیں اور پوری قوت و صلابت سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ زبان و بیان کے زور، تخیل کی بلند پروازی، ڈرامائیت اور قصہ پن نے ان کی رباعیات کو وہ مقام عطا کیا ہے جہاں تک چند ایک رباعی گو ہی پہنچ سکے ہیں۔ ان کی رباعیات کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

15.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	معانی
علی الترتیب	ترتیب وار
غماز	ظاہر کرنے والا
رعنائی	حسن و جمال، خوب صورتی
منصۂ شہود	ظاہر ہونا، سامنے آنا
مروجہ	جو رواج میں ہو
مرقع	تصویر
طبابت	علاج کرنا، ڈاکٹری
نجوم	ستاروں کا علم
رمل	وہ علم جس میں لکیروں کے ذریعے مستقبل کا حال معلوم کیا جاتا ہے

15.9 کتب برائے مطالعہ

1. اردو رباعی	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
2. رباعیات رواں	مرتب: عادل اسیر دہلوی
3. رباعیات محروم	تلوک چند محروم
4. اردو رباعیات	ڈاکٹر سلام سندیلوی
5. انتخاب اردو رباعیات	سلمہ کبریٰ